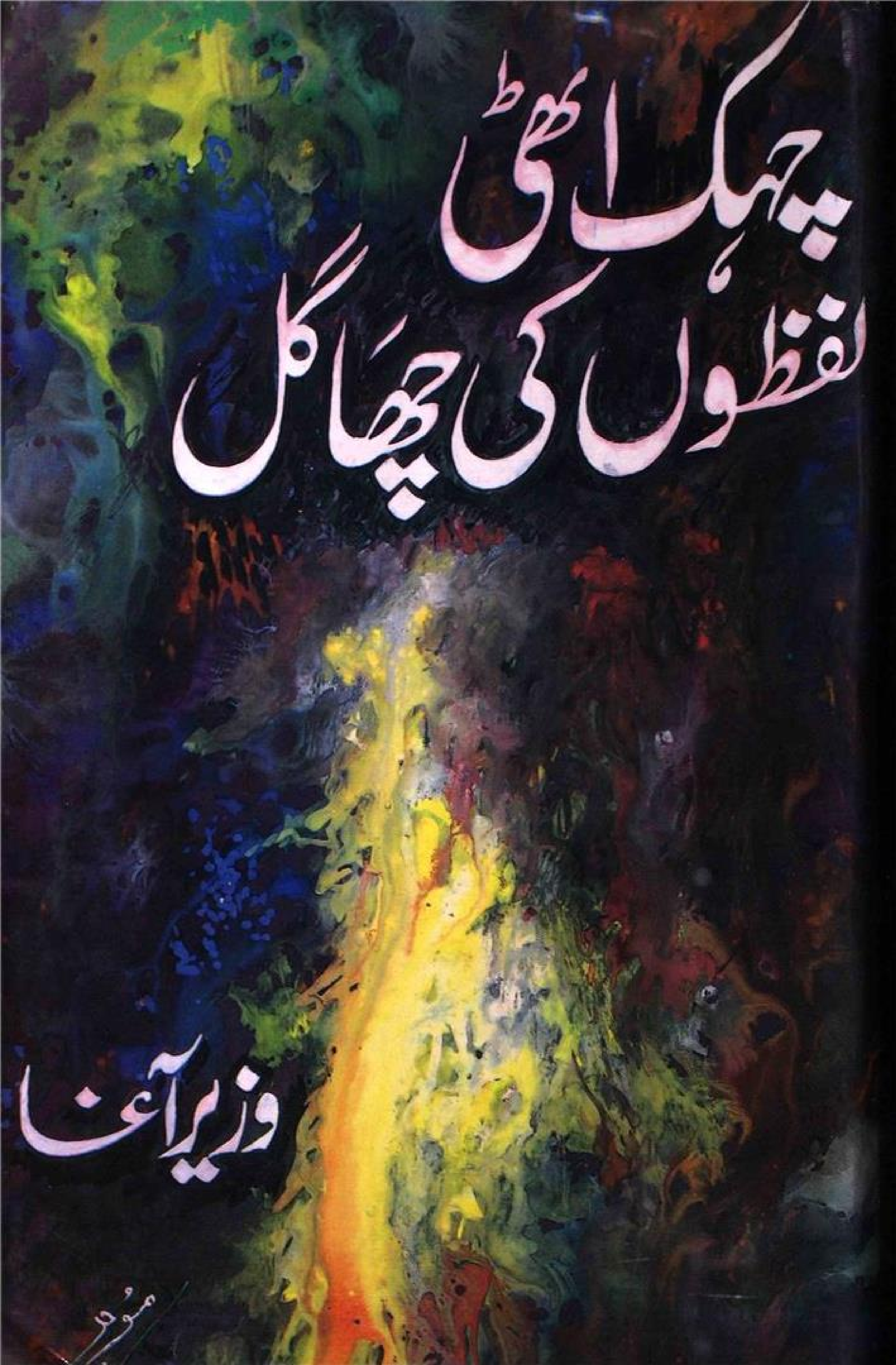
چھنک اٹھی
لفظوں کی چھاگل
وزیر آغا

چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل

(کلیات)

وزیر آغا

مکتبہ فکر و خیال، لاہور

ضابطہ

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

ل
891
W25

طبع : اوّل

ناشر : بذلِ ندیم

مطبع : مکتبہ جدید پریس لاہور

طابع : چوہدری رشید احمد

سرورق : مُوجد

سالِ اشاعت : ۱۹۹۱ء

قیمت : تین سو روپے

مکتبہ فکروخیال، ۱۷۲ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

مشفق خواجہ کے نام

اک بار ہم نے پار کیا چپ کا ریگزار
پھر عمر بھر اُڑے رہے لفظوں کی دھول میں

چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل
ڈار جھکی جب تازوں کی
عکس اُگے پانی کے اندر
دھول اُڑی آوازوں کی

چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل

ترتیب

غزلیں ۱۵

شام اور سائے ۲۰۳

دن کا زرد پہاڑ ۳۱۹

زرد بان ۴۰۳

آدھی صدی کے بعد ۵۰۹

گھاس میں تتلیاں ۶۱۳

اک کتھا انوکھی ۶۸۵

تمام عمر پھرے کاسۂ بدن لے کر
کہ جیسے اپنے ہی دستِ گدا میں تھے ہم بھی

غزلیں

۱۹۶۵ تا ۱۹۹۰

رات بھر کہکشاں کی مالائیں
دانہ دانہ تجھے شمار کریں

غزلیں

ترتیب

دِن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا ۱۵

نام اور رُوپ سے جو بالا ہے ۱۷

جبینِ سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا ۱۹

دُھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا ۲۱

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا ۲۳

کس نے کہا کہ غیب سے پیغام آئیں گے؟ ۲۵

بے زباں کلیوں کا دل میلا کیا ۲۷

ستارہ تو کبھی کا جل بُجھا ہے ۲۹

وہ برنگِ دگر ہی جائے گا ۳۱

کواڑ بجتے تھے اور دل مرا لرزتا تھا ۳۳

اس لبادے کو تار تار کریں ۳۵

دل بضد ہے کہ گنگنائیں تجھے ۳۷

لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو ۳۹

اس کی آوازیں تھے سارے خدوخال اس کے ۴۱

اُس یخ ہَوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے ۴۵

ہر اک اجڑا مکاں اک بد دعا ہے ۴۷

کس کس سے نہ وہ پلٹ رہا تھا ۴۹

فشارِ صبح کی بھیگی فضا میں تھے ہم بھی ۵۱

آسماں پر ابر پارے کا سفر میرے لیے ۵۳

پتّے کے زیورات تھے اُس شاخسار کے ۵۵

شب خوش تھے ہم کہ ناچتے تاروں کے پاس تھے ۵۷

تم اگر پاس بھی ہوتے تو قضا آجاتی ۵۹

یہ نہیں کہ کم سخن ہم سفر ہی ایسا تھا ۶۱

تارا ہوں آسماں کا نہ بادِ نسیم ہوں ۶۳

خوش دیکھ کر مجھے وہ پریشان ہوگیا ۶۵

شام ہمجولی ہے اس کی، شب میری ہم زاد ہے ۶۷

مرجانے کو تیار وہ ہر آن نہیں ہے ۶۹

کُنجِ دل تک تو بے نشاں پہنچے ۷۱

قطرہ قطرہ تیری پلکوں سے اُترنا چاہوں ۷۳

ذہنِ رسا کی گرہیں مگر کھولنے لگے ۷۵

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا ۷۷

صبا خُمار تھی موسم شراب ایسا تھا ۷۹

صبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے ۸۱

ہے تمنّا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں ۸۳

سفید پھول ملے شاخِ سمر کے مجھے

کارگر اس مرتبہ بھی یہ دوا ہو جائے گی ۸۷
خراب رختہ و بے حال و بے بصر جانا ۸۹
کہو صبا سے کہ میرے قریب آئے نہیں ۹۱
کہا یہ کس نے کہ پھولوں سے دل لگاؤں میں ۹۳
آنکھ بے پردہ تھی اُس کی، ہونٹ بے زنجیر تھا ۹۵
خوشبو کے کتنے رنگ ہیں موجِ ہوا سے پُوچھ ۹۷
کیا خبر تھی سُو بہ سُو جائے گا تُو ۹۹
شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں ۱۰۱
پھول رُت آئی تو بے نام تھا بے ننگ تھا وہ ۱۰۳
یہ کیا کہ تیز ہوا سے تو سلسلہ رکھنا ۱۰۵
جو ہو سکے تو تماشا نہ یہ دکھا مجھ کو ۱۰۷
نکلے سفر کو ہم تو قمر ہم رکاب تھا ۱۰۹
وہ کہ تھا چشمۂ صفا کی طرح ۱۱۱
چھوٹا ترا نگر تو ہم اپنے نگر گئے ۱۱۳
بارش ہوئی تو دُھل کے سُبکسار ہو گئے ۱۱۵
کب سے ہے تیری کھوج میں اے صبحِ بے نشاں ۱۱۷
بادل برس کے کھُل گیا رُت مہرباں ہوئی ۱۱۹
وہ پھُول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے ۱۲۱
فقط اک سانس اپنی ہم نوا ہے ۱۲۳
کہتے ہو تم کہ خود میں سمٹنے لگی ہے شام ۱۲۵
کبھی کانٹوں پہ موتی بو گئے ہو ۱۲۷

منظر تھا راکھ اور طبیعت اُداس تھی ۱۲۹
کیا حادثہ ہوا کہ بکھرنے لگی ہے شام ۱۳۱
شب کٹ چکی تھی اور سحر کا پتا نہ تھا ۱۳۳
چھینٹا سا اوس کا مجھے بیدار کر گیا ۱۳۵
مانا کہ تیز آگ کی حدت ہوا میں ہے ۱۳۷
ہے سچ اگر کہ رنگوں کا طُوفان ٹل گیا ۱۳۹
کبھی کبھی وہ نظر مجھ سے بھی مِلاتا ہے ۱۴۱
ترے جہاں میں کوئی پرفشاں نہیں ملتا ۱۴۳
دھار سی تازہ لہو کی شبنم افشانی میں ہے ۱۴۵
آیا وہ تیرے پاس جو خود سے جُدا ہُوا ۱۴۷
شبِ سیاہ میں جس طرح کاہکشاں آباد ۱۴۹
مانا ستارے شب کے سدا جگمگائیں گے ۱۵۱
قابُو ہی میں گر وقت کا رہوار نہیں ہے ۱۵۳
میٹھی باتوں سے مجھے بہلا نہیں ۱۵۵
ستم ہوا کا اگر تیرے تن کو راس نہیں ۱۵۷
وہ کون تھا جو خُون کے دھارے میں بہہ گیا ۱۵۹
رات کے سیپ سے جب دَرد رہا ہوتا ہے ۱۶۱
آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے ۱۶۳
مرے راستے میں جو پتھر پڑا ہے ۱۶۵
تو گم پڑا ہے اپنے خیالوں کی دھول میں ۱۶۷
صورت سے آشنا تھا مگر جانتا نہ تھا ۱۶۹

چمن میں آ کے عجب اپنے دل کا حال ہوا ۱۷۱

بادل چھٹے تو رات کا ہر زخم وا ہوا ۱۷۳

وہ دن کہاں کہ ریت کے اندھے غبار میں ۱۷۵

گر ہم سے نہیں یہ گفتگو ہے ۱۷۷

آنکھ میں تیری اگر صحرا نہیں ۱۷۹

پہلا ہی گرم لُو کا تھپیڑا نہ سہہ سکی ۱۸۱

روک کر خوشبو نے میرا راستہ مجھ سے کہا ۱۸۳

بے صدا، دم بخود فضا سے ڈر ۱۸۵

دکھ بھری اپنی کہانی جو سُنا دی ہم نے ۱۸۷

سفر تمام ہوا اور جہان باقی ہے ۱۸۹

لٹا کر ہم نے پتّوں کے خزانے ۱۹۱

اس گریۂ پیہم کی اذیت سے بچا دے ۱۹۳

گُل نے خوشبو کو تج دیا نہ رہا ۱۹۵

خود سے ہوا جُدا تو ملا مرتبہ تجھے ۱۹۷

تمہیں خبر بھی نہ تھی اور ہم شکستہ حال ۱۹۹

مٹی اُڑی تو پھُولتی سرسوں کا دم گھُٹا ۲۰۰

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور ۲۰۱

دِن ڈھل چُکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہُو بدن کا رَواں مُشتِ پَر میں تھا

حدِّ اُفق پہ شام تھی خیمہ میں منتظر
آنسُو کا اِک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا

جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مُشتعِل
چُھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو ایک کوہِ گراں رہگذر میں تھا

اُترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اِک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

پاگل سی اِک صدا کسی اُجڑے مکاں میں تھی
کھڑکی میں اِک چراغ بھری دوپہر میں تھا

اُس کا بدن تھا خون کی حدّت سے شعلہ وَش
سُورج کا اِک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

نام اور رُوپ سے جو بالا ہے
کس قیامت کے نقش والا ہے

چاندنی اُس کے تن کی اُترن ہے
سبز شبنم گلے کی مالا ہے

چاپ اُبھری ہے دل کے اندر سے
کوئی پلکوں پہ آنے والا ہے

زندگی اِک لہُو کا چھینٹا ہے
عمُر زخموں کی دیپ مالا ہے

آہ اُس یاد کے پَروں کا لمس
جس نے سارا بدن اُجالا ہے

تول سکتا ہے کون خوشبو کو
پھر بھی ہم نے یہ روگ پالا ہے

کِتنا آباد ہے گھنا جنگل
کیسا سنسان یہ شوالا ہے

دیکھ اِس نیری چاندنی شب نے
کتنے تاروں کو رَوند ڈالا ہے

پتّی پتّی ہوئے ہیں پھُول تمام
پھر بھی خاموش پھُول والا ہے

کپکپانے لگے ہیں لب اُس کے
جانے کیا بات کرنے والا ہے

جبینِ سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا
مَیں رہگذر تھا مجھے رَوند کر زمانہ گیا

نقاب اوڑھ کے آئے تھے رات کے قزاق
پگھلتی شام سے سب دھوپ کا خزانہ گیا

کِسے خبر وہ روانہ بھی ہو سکا کہ نہیں
تمہارے شہر سے جب اُس کا آب و دانہ گیا

وہ چل دیا تو نگاہوں سے گدؔ، دلوں سے غرور
لبوں سے زہر، ہواؤں سے تازیانہ گیا

یہ جانتا ہُوں کہ تُو نے لیا تھا روک اُسے
مگر وہ آتشیں آنسُو تجھے جلا نہ گیا؟

مَیں ایک ڈولتا ساگر مجھے اُٹھاتا کون
گھٹا اُٹھا کے چلی تھی مگر چلا نہ گیا

کہاں گیا مَیں بچھڑ کر کِسے خبر ہو گی
جو ایک بار یہاں سے ہوا روانہ، گیا

○

دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا
اب کہاں آئے گا وہ لوٹ کے آنے والا

ریت پر چھوڑ گیا نقش ہزاروں اپنے
کسی پاگل کی طرح نقش مٹانے والا

خشک شاخیں کبھی ایسے تو نہیں چیختی ہیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا؟

عارضِ شام کی سُرخی نے کیا فاش اُسے
پردۂ ابر میں تھا آگ لگانے والا

سفرِ شب کا تقاضا ہے ترے ساتھ رہوں
دشت پُر ہول ہے طوفان ہے آنے والا

مجھ کو در پردہ سُناتا رہا قصّہ اپنا
اگلے وقتوں کی حکایات سُنانے والا

شبنمیں گھاس، گھنے پھُول، لرزتی کرنیں
کون آیا ہے خزانوں کو لُٹانے والا!

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

سحر کی اوس سے کہنا کہ ایک پل نو رُکے
کہ ناپسند ہے ہم کو بھی خاک پر رہنا

تمام عمر ہی گزُری ہے دستکیں سُنتے
ہمیں تو راس نہ آیا خود اپنے گھر رہنا

وُہ خوش کلام ہے ایسا کہ اُس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

سفر عزیز ہَوا کو مگر عزیز ہمیں
مثالِ نکہتِ گُل اُس کا ہم سفر رہنا

شجر پہ پھُول تو آتے رہے بہُت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا اُس کا بے ثمر رہنا

عجیب طرزِ تکلّم ہے اُس کی آنکھوں کا
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا

ورق ورق نہ سہی عمرِ رائیگاں میری
ہَوا کے ساتھ مگر تُم نہ عمر بھر رہنا

ذرا سی ٹھیس لگی اور گھر کو اوڑھ لیا
کہاں گیا وہ تمہارا نگر نگر رہنا

وہ دن گئے کہ چُھپ کے سرِ بام آئیں گے
آنا ہُوا تو اب وہ سرِ عام آئیں گے

سوچا نہ تھا کہ ابرِ سیہ پوش سے کبھی
کوندے تِرے بدن کے مرے نام آئیں گے

اُس نخلِ نامراد سے جو پات جھڑ گئے
اندھی خنک ہواؤں کے اب کام آئیں گے

آنسو، ستارے، اوس کے دانے، سفید پھول
سب میرے غم گسار سرِ شام آئیں گے

تھی کیا خبر کہ روکیں گے دیوار و در ہمیں
لاکھوں پیام ہم کو بہر گام آئیں گے

رکھ اِن کو تو بچا کے کسی اور کے لیے
یہ قول یہ قرار ترے کام آئیں گے

لوٹے اگر سفر سے کبھی ہم تو ڈر نہیں
صورت بدل کے آئیں گے بے نام آئیں گے

بے زباں کلیوں کا دل میلا کیا
اے ہَوائے صُبح، تُو نے کیا کیا

کی عطا ہر گُل کو اِک رنگیں قبا
بُوئے گُل کو شہر میں رُسوا کیا

کیا تجھے وہ صُبحِ کاذب یاد ہے
روشنی سے تُو نے جب پردہ کیا؟

بے خیالی میں ستارے چُن لیئے
جگمگاتی رات کو اندھا کیا

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی
اِک ستارہ دیر تک رویا کیا

رُوٹھ کر گھر سے گیا تُو کتنی بار
کیا در و دیوار نے پیچھا کیا؟

ایک خوابِ بیکراں تھا اور مَیں
تُو نے، لفظِ بے صدا، یہ کیا کیا!

اپنی عُریانی چھُپانے کے لیے
تُو نے سارے شہر کو ننگا کیا

○

ستارہ تو کبھی کا جل بُجھا ہے
یہ آنسو سا تری پلکوں پہ کیا ہے؟

درختوں کو تو چُپ ہونا تھا اک دن
پرندوں کو مگر کیا ہو گیا ہے!

زمیں پر صُورتیں ہی صُورتیں ہیں
فلک پر آنسوؤں کا سلسلہ ہے

سحر کیوں آتے آتے رُک گئی ہے
کہاں وُہ صُبح کا تارا گیا ہے؟

مِری ہر سانس میں خوشبُو ہے اُس کی
کہوں کیسے کہ وُہ مجھ سے جُدا ہے

دھنک دیوار ہے رستے میں حائل
وگرنہ جَست بھر کا فاصلہ ہے

اُسے بند آنکھ سے مَیں دیکھ تو لُوں
مگر پھر عمر بھر کا رَتجگا ہے

اگر صحرا ہوں مَیں صحرا نشیں تُو
صدا دینے کا پھر کیا فائدہ ہے؟

بُہت روکا اُسے پر نہ رُکا وُہ
کبھی جھونکا ہَوا کا بھی رُکا ہے

○

وُہ بہ رنگِ دگر ہی جائے گا
بن کے خوشبو بکھر ہی جائے گا

ایک لمحہ اگر گزُر جائے
دُوسرا تو گزر ہی جائے گا

خوگرِ تیرگی! اگر تُو نے
شمع دیکھی تو ڈر ہی جائے گا

اب خوشی بھی تو دل پہ وار کرے
غم تو یہ کام کر ہی جائے گا

مَیں مُصر ہوں کہ ہم سفر ہو مرا
وہ بضد ہے کہ گھر ہی جائے گا

قیدِ مژگاں سے کر اُسے آزاد
ورنہ آنسو تو مر ہی جائے گا

ضبط کرتا رہا اگر یُوں ہی
یہ شجر بے ثمر ہی جائے گا

نُور میراث آنکھ والوں کی
بے بصر، بے بصر ہی جائے گا

○

کواڑ بجتے تھے اور دل مِرا لرزتا تھا
مَیں برگِ سبز تھا لیکن ہَوا سے ڈرتا تھا

تمام راہوں میں بکھرے پڑے ہیں اُس کے قدم
زمیں کی دُھول سے وُہ کتنا پیار کرتا تھا

مَیں اُس کا کچھ بھی نہیں تھا تو پھر دمِ رخصت
پلٹ پلٹ کے مجھے کس لیے وُہ تکتا تھا

بدن میں اُس کے فروزاں تھا کیا کہ وقتِ سحر
تمام دیپ بجھے تھے مگر وُہ جلتا تھا

بہار ایک چبھن تھی یہیں اُس کا کیا کرتا
خزاں تو زخم تھی اور زخم دل کو لگتا تھا

وُہ ایک شخص کہ تاروں کی لَو تھا جس کا بدن
کبھی کبھی وُہ زمیں پر اُترنے لگتا تھا

ہر ایک پیڑ ہے منقارِ زیرِ پَر اب تو
وُہ شام کیا ہُوئی جب ہر شجر چہکتا تھا

○

اِس لبادے کو تار تار کریں
اک نیا چہرہ اختیار کریں

سیکھ لیں چاندنی سے عیّاری
اور کرنوں کا کاروبار کریں

رات بھر نفرتوں کی شال بُنیں
صُبح دم ہر کسی سے پیار کریں

پھول پھینکیں کہ تیر برسائیں
جی میں جو آئے میرے یار کریں

دل کہ ہے راستے کا اِک پتّھر
آؤ اس کوہِ غم کو پار کریں

رات بھر کہکشاں کی مالا میں
دانہ دانہ تجھے شمار کریں

لب لرزتے ہیں آنکھ پُرنم ہے
اور کیا تیرے غم گُسار کریں؟

○

دل بضد ہے کہ گنگنائیں تجھے
آنکھ کہتی ہے بھول جائیں تجھے

زخم کھا کر گرے سحر کا پرند
سُرخ مخمل کے پَر جگائیں تجھے

گُل کی حِدّت سے جل بُجھا ہے تو
میرے انگار کیا جلائیں تجھے

غم نہیں ہے اگر تجھے مرغوب
کاش خوشیاں ہی راس آئیں تجھے

تُو ہے آنسو کی ایک بُوند۔ بتا!
کیوں سمندر گلے لگائیں تجھے

تیری خُوشبو کرے تری تشہیر
گُنجِ دل میں بھی گر چُھپائیں تجھے

اپنی آواز کی سُنیں فریاد
تُو نہ بولے مگر بُلائیں تجھے

یہ بھی کیا قہقہوں کی چلمن سے
میرے آنسو نظر نہ آئیں تجھے

اِک مُسافر ہے عُمرِ خستہ پا
دن ڈھلے بات یہ بتائیں تجھے

لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو
مِیلا بدن پہن کے نہ اتنا اُداس ہو

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دُور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

اِک جوئے بے قرار ہو کیوں دلکشی ترِی
کیوں اتنی تشنہ لب میری آنکھوں کی پیاس ہو

پہنا دے چاندنی کو قبا اپنے جسم کی
اُس کا بدن بھی تیری طرح بے لباس ہو

رنگوں کی قتل گہ میں کبھی تُو بھی آ کے دیکھ
شاید کہ رنگِ زخم کوئی تجھ کو راس ہو

مَیں بھی نسیمِ صُبح کی صُورت پھروں سدا
شامل گلُوں کی باس میں گر تیری باس ہو

آئے وُہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری
بنجر زمیں پہ، میلوں تلک، سبز گھاس ہو

اُس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اُس کے
وُہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پرَ و بال اُس کے

زرد رُو ایک ہی پَل میں ہُوئی مدھ ماتی شام
لال ہونے بھی نہ پائے تھے ابھی گال اُس کے

کہکشاؤں میں تڑپتے تھے ستاروں کے پرند
سبز آکاش پہ ہر سُو تھے بچھے جال اُس کے

کاٹ ہی لیں گے جُدائی کا زمانہ ہم تو
دیکھئے کیسے گزرتے ہیں مہ و سال اُس کے

ایک دن ہم بھی رکھلے اُس کی حسیں راہوں میں
ایک دن قدموں میں ہم بھی ہوئے پامال اُس کے

چاندنی اُس کا بدن، چاند ہے اُس کا چہرہ
دھان کی کھیتیاں، آنکھوں کے حسیں تال اُس کے

رتجگا ہم بھی منائیں کہ سُنا ہے ہم نے
روز لکھتی ہے سحر، خوُن سے احوال اُس کے

○

کیا لمس تھا کہ سارا بدن جگمگا گیا
پردے اُٹھے، نقاب ہٹے، فاصلہ گیا

پھر ایک دن ہوا نے کہا: مَیں تو تھک گئی
خوشبُو کا بوجھ میری کمر کو جُھکا گیا

ٹھہرو کہ آئینوں پہ ابھی گرد ہے جمی
سینوں کا سارا زہر نگاہوں میں آ گیا

کرتے ہو انتظار عبث اتنا جان لو
لَوٹے گا اب تو شام ہی کو صُبح کا گیا

بننے لگیں گے پھر سے نشانِ قدم اگر
جھونکا ہَوا کا گرد بچھا کر چلا گیا

اِک شبنمیں لباس میں بھیگی پڑی تھی صبح
منظر کسی کی آنکھ کا منظر دکھا گیا

کون اب لکھے گا شام کے ماتھے پہ تیرا نام
سُورج تو تیرا نام بجُھا کر چلا گیا

○

اُس تیغ ہَوا سے بر سرِ پیکار ہم بھی تھے
اپنے ہی گھر میں بے در و دیوار ہم بھی تھے

ہم نے بھی ساری عُمر کیا خوُد کو تار تار
اپنے بدن میں کُند سی تلوار ہم بھی تھے

دامن دریدہ تُم ہی نہیں تھے فقط وہاں
بے آبرُو کھڑے سرِ بازار ہم بھی تھے

اِک لفظِ بے صدا کے رہے ہم بھی منتظر
ہاں اِک نئے جنم کے طلب گار ہم بھی تھے

کوہِ ندا کے سِحر میں گُم سارا شہر تھا
اور شہر کے فسُوں میں گرفتار ہم بھی تھے

کُوزوں کے ساتھ ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں
اُس شہرِ بے مثال کے آثار ہم بھی تھے

ہم سے بھی پُوچھتا کوئی سرکش لہُو کا راز
اپنے بدن کے مالک و مختار ہم بھی تھے

ہر اِک اُجڑا مکاں اِک بد دُعا ہے
صدا اندر صدا اندر صدا ہے

خزاں اِک غم زدہ بیمار عورت
ہوا نے چھین لی جس کی رِدا ہے

ستارہ جل بجھا، مختار تھا وہ
دِیا مجبور تھا، جلتا رہا ہے

سرِ مژگاں اُبھر آنا تھا جس کو
کہاں وہ مہرباں تارا گیا ہے؟

اُگی ہیں چار سُو باتیں ہی باتیں
عجب سی ہر طرف آوازِ پا ہے

ہَوا اِس کو اُڑا لے جا کہیں تُو
یہ بادل اپنے پَر پھیلا رَہا ہے

ہے عُریانی تو عادت چاندنی کی
اندھیرا بے سبب شرما گیا ہے

ستاروں اور شراروں میں ٹھنی ہے
محبّت کی مگر یہ بھی ادا ہے

یہ کیسی آنکھ تھی جو رو پڑی ہے
یہ کیسا خواب تھا جو بُجھ گیا ہے

ہَوا اب چل پڑی ہے تیری جانب
ہَوا کو بادباں راس آ گیا ہے

جو دِل میں پھانس تھی سو رہ گئی ہے
بیاں ورنہ سبھی کچھ ہو گیا ہے

○

کس کس سے نہ وہ لپٹ رہا تھا
پاگل تھا، یُونہی چمٹ رہا تھا

دِن رات گزُر رہے تھے ایسے
مَیں جیسے وَرق اُلٹ رہا تھا

ساگر میں نہیں تھی موج اِک بھی
ساحل تھا کہ پھر بھی کٹ رہا تھا

میں بھی تو چھپٹ رہا تھا خود پر
جب میرا اثاثہ بٹ رہا تھا

دیکھا تو نظر تھی اُس کی جل تھل
مشکیزۂ ابر پھٹ رہا تھا

قسمت ہی میں روشنی نہیں تھی
بادل تو کبھی کا چھٹ رہا تھا

نشہ تھا چڑھاؤ پر سحر دم
پیمانۂ عمر گھٹ رہا تھا

○

فشارِ صبح کی بھیگی فضا میں تھے ہم بھی
بکھرتے پھول کی صورت ہوا میں تھے ہم بھی

تم آگئے تو یہ اچھا ہوا وگرنہ یہاں،
شریک ہونے کو اس کی صدا میں تھے ہم بھی

سحر ہوئی تو فلک پر تھے چیتھڑے اس کے
وہ ابرِ تیرہ کہ جس کی قبا میں تھے ہم بھی

بجا کہ ابر کی صورت تھے تُم پسِ مژگاں
مثالِ وحشت دلِ نارسا میں تھے ہم بھی

گرا وہ شخص تو ہم بھی گرے تھے ساتھ اُس کے
ملی سزا تو شریک اُس سزا میں تھے ہم بھی

شکست کھا کے بھی تم کب تھے ماننے والے
یہ اور بات کہ اپنی انا میں تھے ہم بھی،

تمام عُمر پھرے کاسۂ بدن لے کر،
کہ جیسے اپنے ہی دستِ گدا میں تھے ہم بھی

نجانے کب سے مُعلّق تھی وہ فضاؤں میں
اُسی شکستہ سی آوازِ پا میں تھے ہم بھی

وہ ایک شخص کہ تھا جس کا سلسلہ خُود سے
کرو یہ شُکر کہ اس کی دُعا میں تھے ہم بھی

○

آسماں پر ابر پارے کا سفر، میرے لئے!
خاک پر مہکا ہُوا چھوٹا سا گھر، میرے لئے!

بج اُٹھیں لفظوں کے گھنگھرو، خاکداں آباد ہو
وجد میں آنے لگیں سارے شجر، میرے لئے

دُور تک، اُڑتے ہوئے جگنو تری آواز کے
دُور تک ریگِ رواں پر اِک نگر میرے لئے

آشنا نظروں سے دیکھیں رات بھر تارے تجھے
گھورتی آنکھوں کی یہ بستی مگر میرے لئے

لے گئی ہے ساری خوشبو چھین کر ٹھنڈی ہوا
پتّیاں بکھری پڑی ہیں خاک پر میرے لئے

بند اُس نے کر لئے تھے گھر کے دروازے اگر
کیوں کھلا پھر رہ گیا تھا ایک در میرے لئے

خاک پر بکھرے ہوئے قدموں تلے رَوندے ہوئے
تحفتہً لائی ہوا میرے ہی پَر میرے لئے!

پتّے کہ زیورات تھے اُس شاخسار کے
ایسی چلی ہوا کہ ہوئے رہگزار کے

رُک رُک کے بج رہی تھیں شگوفوں کی جھانجھنیں
ڈر ڈر کے آ رہے تھے پرندے بہار کے

جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مُسافر اُتار کے

کس کے جلو میں آئی سحر کچھ خبر نہیں
جز یہ کہ ہر طرف تھے شگوفے انار کے

تالی بجا کے تُو نے اُڑائے بہت مگر
زخمی پرند اُڑ نہ سکے شاخسار کے

آنگن کی راکھ ریشمیں آنچل میں بس گئی
جُوڑے کے ساتھ سُوکھ گئے پھول پیار کے

زینے سے آفتاب کے اُتری سفید دھُوپ
کپڑے زمیں پہ بچھ گئے اُس بانکی نار کے

اس راہ سے ضرور گزر کر گیا ہے وہ
کانٹے لہو میں تر ہیں اگر خار زار کے

کچّے گھڑے کی ناؤ میں کرتے رہے سفر
کیسے عجیب لوگ تھے دریا کے پار کے

شب خوش تھے ہم کہ ناچتے تاروں کے پاس تھے
جاگے سحر کے وقت تو کتنے اُداس تھے

ہاں! اے ہوا ہمیں بھی بتا اُن کا کیا ہُوا
وہ پھول سے بدن جو ترے آس پاس تھے

مٹّی میں مِل کے بھی نہ مِٹے وہ خجستہ پَے
گلیوں کی باس تھے کبھی کھیتوں کی باس تھے

اُس شہرِ ناسپاس کو تُو نے سزا تو دی،
کیا شہر کے تمام مکیں ناسپاس تھے؟

جا بھی چُکے تھے اور رُکے بھی کھڑے تھے ہم
اپنے سے دُور جا کے بھی ہم اپنے پاس تھے

کس دَور میں رہے تیری آوازِ پا نہ ہم
ہم تو ترے غلام تھے ہم تیرے داس تھے

رَوندے گئے سُموں سے مگر بار بار ہم
ہر چند ہم زمیں پہ بچھی سبز گھاس تھے

تُم اگر پاس بھی ہوتے تو قضا آجاتی
اُس خرابے سے نکل کر وہ بلا آجاتی

دیکھ کر کوہِ ندا ہم سے رُکا بھی نہ گیا
ہم ٹھہر جاتے تو ہم تک بھی صدا آجاتی

شُکر کر ہم نہ گئے ورنہ نگر میں تیرے
دستکیں دیتی ہوئی سرد ہوا آجاتی

ہم طلب کرتے تو الفاظ کی ٹھنڈی مہکار
آسمانوں سے اُتر کر بخُدا آجاتی

دمِ رُخصت جو اُسے تُو نے پُکارا ہوتا
لیئے پلکوں پہ وہ آنسو کا دِیا آجاتی

پار کر سکتے اگر رات کے کاجل کی لکیر
صُبح اوڑھے ہوئے کرنوں کی رِدا آجاتی

سب نظر آتے ہمیں، ہم نہ دکھائی دیتے
ہاتھ اپنے بھی وہ جادُو کی قبا آجاتی

○

یہ نہیں کہ کم سخن ہم سفر ہی ایسا تھا
اپنا اُس سے رابطہ مختصر ہی ایسا تھا

کھڑکیوں میں جا بجا سوچتے مناظر تھے
آنسوؤں میں تر بتر وہ سفر ہی ایسا تھا

کٹ گئی تمام عمر پھول اُس پہ پھینکتے
مہرباں نہ ہو سکا بے خبر ہی ایسا تھا

بے سبب گراتا تھا اپنے سارے پھول پھل
باغباں کرتا کیا وہ شجر ہی ایسا تھا

سجدہ ریز ہونے کا ڈھنگ اُسے نہ آسکا
بے بَصر ہی ایسا تھا، بے ہُنر ہی ایسا تھا

رات دِن بھٹکتا تھا تنگ بند گلیوں میں
اُس ہراساں شہر میں وہ نڈر ہی ایسا تھا

بھُول ہی گیا آخر اَپنا دیس، اَپنا گھر
وہ ہَوا کا ہم سفر دَر بَدر ہی ایسا تھا

تارا ہُوں آسماں کا نہ بادِ نسیم ہُوں
اِک لفظِ بے صدا ہُوں دِلوں میں مقیم ہُوں

لِکھا گیا ہُوں لوحِ بدن پر ہزار بار
کاتب بدل گئے ہیں مگر مَیں قدیم ہُوں

میرا نصیب مَیں نہ چلا آبِ جُو کے ساتھ
مَیں تو ازل سے قیدِ رہِ مُستقیم ہُوں

ایسا بھی کیا کہ تیرے لئے مر مٹوں گا مَیں
مت یہ سمجھ کہ آپ مَیں اپنا غنیم ہُوں

کب سے مَیں خُود کو اوڑھ کے بیٹھا ہُوں جیسے مَیں
مُشکِ ختن ہُوں نافۂ تن میں مقیم ہُوں

○

خُوش دیکھ کر مجُھے وہ پریشان ہو گیا
رنجور بے سبب ہی وہ نادان ہو گیا

پلکوں سے بُوند بُوند گری رَوشنی تمام
دِل کا غُبار آنکھ کا طُوفان ہو گیا

اُس مَوجۂ لباس کی خوشبُو سے سارا شہر
گُل ریز ہو کے اَور بھی گُنجان ہو گیا

درپردۂ سیلِ تُند تھی وہ نظرِ التفات
مَیں اُس نظر پہ ایسے ہی قُربان ہو گیا

سوچا تو سبز شاخ تھا وہ مہرباں مگر
دیکھا تو چوبِ خُشک کا عنوان ہو گیا

کیسے کہوں وہ میری نظر میرا مان تھا
سب جانتے ہوئے بھی جو انجان ہو گیا

اُس بے وفا سے قطعِ تعلق کی دیر تھی،
جینا بھی اَور مرنا بھی آسان ہو گیا

کُچھ دُور تک مَیں خُود ہی رہا اپنا ہم سفر
پھر اس کے بعد راستہ سُنسان ہو گیا

○

شام ہمجولی ہے اس کی، شب میری ہم زاد ہے
گھاس کی صورت زمیں پر ہر طرف آباد ہے

بوند ہوں پانی کی، مَیں محبوس اپنی آنکھ میں
تُو ہواؤں میں ابر پارے کی طرح آزاد ہے

ٹوٹتا پھر کیوں نہیں یہ دُشمنی کا سِلسلہ
تُم اگر کہتے ہو، ہر رشتے کی اِک میعاد ہے؟

کیا مِلا مُجھ کو مرے اِس شہر سے جُز لیے زخمی
میرے تن کی خشتِ پر جس شہر کی بنیاد ہے

ہر طرف پھیلا دیئے ہیں سُرخ ڈورے جال کے
آنکھ کی پُتلی میں کوئی سنگ دِل صیّاد ہے

اُگ رہی ہیں اُودی اُودی اَن گنت یادیں اگر
مت کہو پھر کشتِ جاں بے آب ہے، برباد ہے

دار پر لٹکی ہوئی ہے جانے کب سے یہ زمیں،
اور سر پر آسماں اِک سر پھرا جلّاد ہے

گر نہیں تیرے مُقدّر میں خوشی تو غم نہ کر
شاد ہو اِس بات پر یاں ہر کوئی ناشاد ہے

○

مر جانے کو تیار وہ ہر آن نہیں ہے
نادان سہی اتنا بھی نادان نہیں ہے

شیرینیِ گفتار نہیں گر میری پہچان
خوشبوئے بدن تیری بھی پہچان نہیں ہے

ناواقفِ خوں گشتہ سحر میں بھی نہیں ہوں
انجان مگر تو بھی مری جان نہیں ہے

کچھ دیکھ لیا ہوگا مری آنکھ میں ورنہ
بے وجہ ترے لب پہ یہ مُسکان نہیں ہے

آ صورتِ شبنم ہی کبھی میری طرف تُو
سُورج کے نکلنے کا تو امکان نہیں ہے

اُن رنگ بدلتی ہُوئی آنکھوں کی ہر اک بات
آسان ہے، پر اتنی بھی آسان نہیں ہے

وُہ شخص کہ مانندِ صبا گزرا چمن سے
بے گھر سہی پر بے سروسامان نہیں ہے

آنکھوں میں جراحت کی رمق باقی ہے ورنہ
پہلی سی وُہ اب صورتِ پیکان نہیں ہے

اک رات کبھی اپنے بدن میں بھی گزاروں
صحرائے بدن اتنا تو سنسان نہیں ہے

گُنجِ دل تک تو بے نشاں پہنچے
پھر نجانے کہاں کہاں پہنچے

تشنگی کی سبیل جاری تھی
ہم مُسافر جہاں جہاں پہنچے

ایک مُدّت کے بعد ہم آخر
اپنے اور اُس کے درمیاں پہنچے

کیسے سر ہو یہ روشنی کا پہاڑ
کیسے منزل پہ خستہ جاں پہنچے

اِک پرندہ ہے یہ زمیں، دیکھیں
کس شجر پر یہ بے زباں پہنچے

لمسِ گُل بھی نہ مَیں کروں منظور
اُس کی جاں کو اگر زیاں پہنچے

دشت در دشت ہے مُسافتِ شب
کس خرابے میں کارواں پہنچے

○

قطرہ قطرہ تیری پلکوں سے اُترنا چاہوں
ہو سکے مجھ سے تو یہ کام بھی کرنا چاہوں

زہر لفظوں کا تو رِستا ہے شگافِ لب سے
اور میں چہرے کے اِس زخم کو بھرنا چاہوں

سوکھتے پیڑ کی شاخوں سے رہائی مانگوں
خشک پتّا ہوں زمیں پر میں اُترنا چاہوں

دن چڑھے وعدوں کی خوشبو میں بسا لوں خود کو
شام آئے تو مَیں ہر شے سے مُکرنا چاہوں

موت کو دیکھ کے جِینے کی دُعائیں مانگوں
زندگی پاؤں پڑے اور مَیں مرنا چاہوں

مَیں دبے پاؤں ترے سوئے ہُوئے آنگن سے
صُبح کی پہلی کرن بن کے گزرنا چاہوں

کیوں نہ رُک جاؤں تجھے دیکھ کے اے چاندنی شب!
اوس بن کر ترے قدموں میں بکھرنا چاہوں

ذہنِ رسا کی گرہیں مگر کھولنے لگے
پھر یوں ہُوا کہ لوگ ہمیں تولنے لگے

آہستہ بات کر کہ ہَوا تیز ہے بہت
ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

عُمرِ رواں کو پار کیا تُو نے اور ہم
رسّی کے پُل پہ پاؤں رکھا ڈولنے لگے

دستک ہَوا ہی دے کہ یہ سنّاٹا ختم ہو
سُونے گھروں میں کوئی تو رَس گھولنے لگے

مَیں بن گیا گھُر تو مِرا اس میں دوش کیا
بے وجہ مجھ کو خاک میں تم رولنے لگے

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا
رات بھر نافۂ گُل بن کے مہکنے والا

لکۂ ابر تھا ـــــ بس دیکھنے آیا تھا مجھے
کوئی بادل تو نہیں تھا وہ چھلکنے والا

راکھ میں، آنکھ میں، پھولوں پہ، کسی شب میں
بے ضرورت بھی تو چمکا ہے چمکنے والا

کس کی آواز میں ہے ٹوٹتے پتّوں کی صدا
کون اِس رُت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

چاند ہو، روز بدلتے ہو، تمہارا کیا ہے
مَیں سمندر ہوں اَبد تک نہ بہکنے والا

پی لیا؟ لوٹ گیا؟ خشک ہُوا؟ — کچھ تو بتا
کیا ہُوا آنکھ سے آنسو وہ ٹپکنے والا

○

صبا خمار تھی موسم شراب ایسا تھا
بدن کی شاخ پہ چہرہ گلاب ایسا تھا

اِک اضطراب سا لفظوں کی کائنات میں تھا
تہِ خیال کہیں پیچ و تاب ایسا تھا

سحر تھی سادہ ورق آفتاب کاتب تھا
ظہورِ عالمِ امکاں کتاب ایسا تھا

بس ایک پَل میں وُہ ٹکرا کے مجھ سے ٹُوٹ گیا
سحر کا خواب بھی نازک حُباب ایسا تھا

تھا سطحِ آب پہ جیسے کوئی نگر آباد
چمکتا قریۂ جاں زیرِ آب ایسا تھا

سُنائی دیتی نہیں تھی مجھے مری آواز
تمہارے شہر میں رہنا عذاب ایسا تھا

تھی خُشک پتّوں کی آواز ہم رکاب اُس کی
کہ خود ہَوا ہی میں کچُھ اضطراب ایسا تھا؟

کھُلی جو آنکھ تو دشتِ خیال تھا ہر سُو
پھر اُس کے بعد سفر سارا خواب ایسا تھا

صبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے
رات بھر شہر مگر سارے کا سارا ناچے

تُم یہ کہتے ہو کہ پٹ کھول کے کھڑکی چہکے
اور کجرائی نگاہوں میں اشارہ ناچے

مَیں یہ کہتا ہوں کہ آنسو کا دیا جل اُٹھے
اور پُرشور سمندر کا کنارا ناچے

مسکراہٹ پہ لگائی تو ہے قدغن تُو نے
تیرے ہی لب پہ اگر نور کا دھارا ناچے

یہ بھی کیا شام کے بُجھتے ہوئے آتش داں میں
راکھ کی سیج پہ تا دیر شرارا ناچے

آ ہوئے جاں بھی تو اِس دشت کو مہکائے کبھی
ایک دن اپنا بھی یہ راج دُلارا ناچے

رقص کا سلسلۂ شام و سحر ختم ہُوا
مسندِ رقص پہ اب آخری تارا ناچے

ہے تمنّا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں
تُم مقابل رہو ہم آئینہ بردار رہیں

قافلے آئیں، اُڑے گرد، چلے جائیں کہیں
اور ہم خاک بسر، نقش بہ دیوار رہیں

ہے یہ دستور گریں سال میں پتّے اِک بار
اشک گرتے میری پلکوں سے لگاتار رہیں

جی یہ کہتا ہے کہ اک روز پہن لیں خود کو
اور پھر حشر تلک زینتِ بازار رہیں

کاش آئیں نہ ابھی نیرِّ تاباں والے
اور کچھ دیر ستاروں کے یہ گلزار رہیں

چیختے ناچتے لفظوں کی سیہ آندھی میں
آپ کیوں مُہر بہ لب صورتِ دیوار رہیں؟

بے خطا بھی تو گزارا ہے زمانہ ہم نے
اب خطاکار ہوئے ہیں تو خطاکار رہیں!

○

سفید پھول ملے شاخِ سیم بر کے مجھے
خزاں کو کچھ نہ ملا بے لباس کر کے مجھے

تھی دشتِ خواب میں اک تیری جستجو مجھ کو
کہ تجھ سے شکوے ہزاروں تھے عمر بھر کے مجھے

میں اپنے نام کی تختی میں تھا، شریر ہوا
گلی میں پھینک گئی بے نشان کر کے مجھے

اب اُس نگر میں تو کچھ بھی نہیں ہے ۔ رُک جاؤ
صدائیں دیتے پھرو گے گھروں سے ڈر کے، مجھے

مجھے یقیں نہ ملی تجھ کو دولتِ بیدار
تجھے یہ وہم ملے ڈھیر سیم و زر کے مجھے

کبھی گلے نہ لگایا مجھے مگر پھر بھی
طواف کرنے پڑے شہرِ بے ثمر کے مجھے

سُلا دیا جرسِ ناقۂ سحر نے اُسے
"جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے"

کارگر اس مرتبہ بھی یہ دوا ہو جائے گی
دیکھ لینا دَرد کی شدّت سوا ہو جائے گی

یوں ہی گر چلتی رہی بے آسرا بے سنگِ میل
فاصلوں کی گرد میں پاگل ہوَا ہو جائے گی

دائرے کے گُنبدِ بے دَر میں ہو جائے گی بند
اور پھر بے دست و پا تیری صدا ہو جائے گی

ایک پَل دیکھے گی تجھ کو آشنا نظروں کے ساتھ
دُوسرے پَل بے سبب نا آشنا ہو جائے گی

کیا خبر تھی اِس قدر شدّت کا ہو گا انتظار
راستے کی ہر صَدا آوازِ پا ہو جائے گی

رات بھیگے گی تو ہر تارا چُبھن بن جائے گا
رفتہ رفتہ خُوں میں تر شب کی قبا ہو جائے گی

○

خراب و خستہ و بے حال و بے بصر جانا
ہوا کو ہم نے مگر پھر بھی ہم سفر جانا

ہُوا وُہ نغمہ سرا جب تو رابطے ٹُوٹے
رہا نہ یاد کسی کو بھی اپنے گھر جانا

تھی کیا خبر کہ وُہ اِک پَل میں پَرفشاں ہو گا
وُہ جس کو ہم نے سدا مُشتِ بال و پَر جانا

وفا شعار کو دی تم نے دُشمنوں میں جگہ
جو دُشمنوں میں تھا اُس کو عزیز تر جانا

اور اب یہ حال کہ بیٹھے ہیں رہگزر میں کہیں
خُدا ہی جانے کہ ہم کو تھا کس نگر جانا

اُسے یہ وہم کہ وُہ اِک شجر ہے سایہ دار
ہمیں ملال کہ ہم نے اُسے شجر جانا

قدم قدم پہ رُکی عمرِ رائیگاں اپنی
کہ خود کو ہم نے سدا سنگِ رہگزر جانا

کہو صبا سے کہ میرے قریب آئے نہیں
مجھے گلاب سمجھ کر گلے لگائے نہیں

یقیں دلاؤ نہ مجھ کو تم پرائے نہیں
مجھے تو زخم لگے تم نے زخم کھائے نہیں

عجیب شخص ہو چڑیا سے روز کہتے ہو
سلگتی دھوپ میں سوکھے شجر پہ آئے نہیں

یہ آئینہ کسی اُجڑے مکاں کا آئینہ ہے
یُں گرد صاف بھی کر دُوں تو مُسکرائے نہیں

رُکوں تو تنکے بھی اُڑنے لگیں سوئے افلاک
اُڑوں تو کوئی پرندہ بھی پَر ہلائے نہیں

مکاں خموش اگر ہے تو دوش کس کا ہے
کرے بھی کیا جو کوئی اُس کو گھر بنائے نہیں

نجانے کب سے مرے شہر کے دَر و دیوار
بُلا رہے ہیں اُس اک شخص کو جو آئے نہیں

کہا یہ کس نے کہ پھولوں سے دل لگاؤں مَیں
ترے خیال کو چھوڑوں تو مر نہ جاؤں مَیں

یہ ایک تُو ہے کہ چمکے ہے چاکِ اَبر میں تُو
یہ ایک مَیں ہوں کہ بارش کے تیر کھاؤں مَیں

عجب نہیں کہ تِری آنکھ میں بھی نُور آئے
کرن سی بن کے کبھی تیرے در پہ آؤں مَیں

تمام رات چُرائے تُو اوس کے موتی
تمام رات ستاروں کے گُرز کھاؤں مَیں

مَیں کس زمین میں دفناؤں اپنی آنکھوں کو
کہاں یہ دولتِ بیدار لے کے جاؤں مَیں

اُٹھوں کہ دُھوپ تو اب آگئی منڈیروں پر
جو گھر میں سوتے پڑے ہیں اُنہیں جگاؤں مَیں

ہے بات اتنی کہ تجھ بن رہی نہ بات کوئی
مگر یہ بات تجھے کس طرح بتاؤں مَیں؟ [۱]

---

۱ نسیم شمائلپوری مرحوم کی یاد میں

○

آنکھ بے پردہ تھی اُس کی، ہونٹ بے زنجیر تھا
سلسلہ الفاظ کا چلتی ہُوئی شمشیر تھا

تیرگی بے آبرو تھی اور تجلّی بے وقار
اِک تھکا ہارا سا جگنو کس قدر دلگیر تھا

وُہ بھی کیا دن تھے کہ بے چہرہ پھرا کرتے تھے لوگ
آدمی جب آدمی کی ہو بہُو تصویر تھا

جُرم تھا میرا کہ مَیں نے جُرم میں شرکت نہ کی
تھی مِری تقصیر بس اتنی کہ بے تقصیر تھا

فاصلوں کی ڈور میں اُلجھی ہُوئی تھی رہگزر
رہگزر کے پیچ و خم میں قید اک راہگیر تھا

تھا سلونی جھیل کے ہاتھوں میں اک سونے کا تھال
تھال پر نوحہ ہَوا کا جا بجا تحریر تھا

بن گیا ہوتا مَیں مُشتِ خاک سے خاکِ شفا
صُبح کی پہلی کرن کا لمس بے تاثیر تھا

دیکھتے ہی دیکھتے اُبھری فلک پر قوسِ رنگ
اور پھر چہرہ تمہارا جیسے اِک تصویر تھا

آج پتّھر کی طرح حائل ہُوں اپنی راہ میں
مَیں کہ کل تک بے نشاں تھا اور بے توقیر تھا

○

خوشبو کے کتنے رنگ ہیں موجِ ہَوا سے پُوچھ
عارض سے چُھوٹتے ہُوئے رنگِ حنا سے پُوچھ

پُھولوں بھری رِدا کو کہاں لے گئی ہَوا
رستے کے ہر مُسافرِ خستہ قبا سے پُوچھ

اُس دشتِ بے اماں میں گئی کتنی دُور تک
کچُھ تو صدائے حلقۂ زنجیرِ پا سے پُوچھ

دھنسنے لگا ہے گرد کی دلدل میں سارا شہر
کیا ہو گیا ہے، شہر کی آب و ہوا سے پُوچھ

اندھی مُسافتوں کا دیا اِذن کس لیے
اب پوچھنا ہے میرا پتہ تو ہوا سے پُوچھ

چہکے پرند، حجرۂ شب بولنے لگا
آثار کیا یہی ہیں سحر کے، خدا سے پُوچھ

(۷)

کیا خبر تھی سُو بہ سُو جائے گا تُو
اِک صدا بن کر بکھر جائے گا تُو

رُو بہ رو پائے گا خود کو بار بار
چھوڑ کر خود کو کہاں جائے گا تُو

آنکھ میں آئے گا آنسو کی طرح
اوس کی صُورت چلا جائے گا تُو

میں صبا کے پیرہن میں آؤں گا
صورتِ خوشبو بکھر جائے گا تُو

اِک صدا بن کر اُٹھے گا خاک سے
اور فلک کو پار کر جائے گا تُو

یا نکل کر جامۂ گُل سے فقط
باغ کی دیوار تک جائے گا تُو؟

اے تھکے ہارے مُسافر کچھ بتا
اور کتنی دُور اب جائے گا تُو

شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
پنچھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں

رات آئے تو یادوں کے سب زخم ہرے ہو جاتے ہیں
سانپوں ایسے تارے ہم کو ڈنک چبھونے لگتے ہیں

صبح سویرے رات کے رہزن پھول اور چاند اور تارے سب
شبنم کے چھینٹوں سے اپنے چہرے دھونے لگتے ہیں

لفظوں کی آواز سے کیوں اب خوف سا ہم کو آتا ہے
کیوں ہم کو اب مرمر ایسے بدن سلونے لگتے ہیں

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے موجوں کا سر جُھک جاتا ہے
اور کشتی کو کشتی والے آپ ڈبونے لگتے ہیں

اک تم ہو جو دُکھ کو ٹھوکر مار کے آگے بڑھتے ہو
اِک ہم ہیں جو سینے میں اس دُکھ کو بلونے لگتے ہیں

○

پھُول رُت آئی تو بے نام تھا بے ننگ تھا وہ
اور خزاں آئی تو اک جلوۂ صد رنگ تھا وہ

ضبط کرتا تھا مگر بات نکل جاتی تھی
اپنی آواز کی لرزش سے بہت تنگ تھا وہ

کیا کہوں، کس سے کہوں، کون سُنے گا میری
ان سُنی اُس نے بھی کی گرچہ مرے سنگ تھا وہ

آج وہ دُشمنِ جاں ہے۔ کبھی وہ بھی دن تھے
مری خوشبُو، میری بینائی، مرا انگ تھا وہ

وہ تھا جھنکار مجسّم وہ تھا جھنکار تمام
اور نغمُ کہتے ہو اِک نزشا ہُوا سنگ تھا وہ

یاد ہے آج بھی وُہ ساعتِ نمناک مجھے
مَیں تھا آنسو کی طرح چشمِ سیہ رنگ تھا وہ

وُہ کہ اب عالمِ حیرت سے ہے محروم، کبھی
دیکھ کر پھُول کی پتّی کو ہُوا دنگ تھا وہ

مجھ سے بچھڑا تو ہُوا اُس کو نہ پھر چین نصیب
کبھی فرسنگ، کبھی کتنے فرسنگ تھا وہ

یہ کیا کہ تیز ہَوا سے تو سلسلہ رکھنا
ہَوا میں اُڑتے پَروں کا نہ کچھ پتا رکھنا

نکل پڑے ہو سفر کو تو شاہراہ کے ساتھ
کسی کی یاد کے کتبے جگہ جگہ رکھنا

پگھلتی شام سے کہنا نہ کچھ دمِ رخصت
وہ رو پڑے گی مگر تُم تو حوصلہ رکھنا

عجب نہیں کہ مُسافر پلٹ کے آ جائے
لرزتی پلکوں پہ اک دیپ سا جلا رکھنا

عزیز رکھنا تُم آباد موسموں کو مگر
کھنڈر رُتوں سے بھی تھوڑا سا رابطہ رکھنا

سرشت اُس کی قصیدہ، غزل مزاج مرا
قریب لا کے بھی ہم کو جُدا جُدا رکھنا

بُھلا نہ دینا مجھے جب مَیں اپنا گھر چھوڑوں
بچا کے میرے لیے بھی کوئی دُعا رکھنا

○

جو ہو سکے تو تماشا نہ یہ دِکھا مجُھ کو
ترا ہی رُوپ نظر آئے جا بجا مجُھ کو

کبھی تو کوئی فلک سے اُتر کے پاس آئے
کبھی تو ڈسنے سے باز آئے فاصلہ مجُھ کو

تلاش کرتے ہو پھُولوں میں کیسے پاگل ہو
اُڑا کے لے بھی گئی صُبح کی ہَوا مجُھ کو

کِسے خبر کہ صدا کس طرف سے آئے گی
کہاں سے آ کے اُٹھائے گا قافلہ مجھ کو

تھا میرا نقشِ قدم ہی مرے تعاقب میں
وگرنہ لاکھ بُلاتی تری صدا، مجھ کو

سمیٹتا رہا خود کو مَیں عُمر بھر لیکن
بکھیرتا رہا شبنم کا سِلسلہ مجھ کو

کُھلی جو رات کی خوشبُو تو سازشی جاگے
دہکتی آنکھوں نے گھیرے میں لے لیا مجھ کو

ٹھہر سکی نہ اگر چاندنی تو کیا غم ہے
یہی بہت ہے کہ تُو یاد آ گیا مجھ کو

○

نکلے سفر کو ہم تو قمر ہم رکاب تھا
پھر صبح تک رفاقتِ شب کا عذاب تھا

دیکھا تو اک خفیف سی لرزش لبوں پہ تھی
پلکوں کے ساتھ چپکا ہوا کوئی خواب تھا

یہ بھی نہیں کہ تیری نظر مہرباں نہ تھی
تارا مرے نصیب کا زیرِ عتاب تھا

پڑھتے تھے صبح و شام اُسے بار بار ہم
جیسے زمانہ ایک مقدّس کتاب تھا

دیکھا جو ریگ زارِ تصور سے تو میرا گھر
آبِ رواں پہ بہتا ہوا اِک گلاب تھا

میرے دُکھی سوال کا اُس شام تیرے پاس
بھیگی ہوئی نظر کے سِوا کیا جواب تھا

گر وہ زمانہ یاد کہ تھی آنکھ میں حیا
مابین دوستوں کے ابھی کچھ حجاب تھا

○

وہ کہ تھا چشمۂ صفا کی طرح
کل مِلا مجھ کو زخمِ پا کی طرح

کون زندہ ہے اِس اندھیرے میں
اِک سِسکتی ہوئی صدا کی طرح

زنگ آلود گھر کا سنّاٹا،
اور مَیں —— چیختی ہَوا کی طرح!

دوستی پتھروں سے مَیں نے کی
شام کی نرم دِل گھٹا کی طرح

تیز ناخن ہیں تیرے دُشمن کے
اَور تُو ــــ پھُول سی قبا کی طرح

بستروں میں دبک گئے تارے
چاند نِکلا کِسی بَلا کی طرح

چاندنی گر پڑی درختوں پر
جاں بلب آخری دُعا کی طرح

○

چھُوٹا تِرا نگر تو ہم اپنے نگر گئے
گہرے سمندروں کی تہوں میں اُتر گئے

شاید کہ تُو نے کھول دی مُٹھیّ بھری ہوئی
طشتِ فلک میں نقرئی سِکّے بکھر گئے

ہونٹوں کے سیپ سُوکھے پڑے ہیں تو غم نہیں
آنکھوں کے خُشک تال تو پانی سے بھر گئے

جھونکے نے بڑھ کے پیڑ کو چھیڑا تو دفعتاً
اُڑتے ہوئے فضا میں پرندوں کے پَر گئے

کہنے لگا کہ میں نے تمھیں کتنا دُکھ دیا
سپنے تمہارے چھین لئے، سب بکھر گئے

اے آفتاب! آئینہ تیرا اگر ہے صاف
بتلا مجھے کہاں وہ مرے ہم سفر گئے؟

خود سے کہا کہ سایہ نہیں وہ ہے ساتھ ساتھ
یوں ہم ہوا میں اُڑتے ہوئے اپنے گھر گئے

○

بارش ہوئی تو دھل کے سُبکسار ہو گئے
آندھی چلی تو ریت کی دیوار ہو گئے

رہوارِ شب کے ساتھ چلے جو پیادہ پا
وہ لوگ خود بھی صورتِ رہوار ہو گئے

سوچا یہ تھا کہ ہم بھی بنائیں گے اُس کا نقش
دیکھا اُسے تو نقش بہ دیوار ہو گئے

قدموں کے سیلِ تُند سے اب راستہ بناؤ
نقشوں کے سب رواج تو بے کار ہو گئے

لازم نہیں کہ تُم سے ہی پہنچے ہمیں گزند
خود ہم بھی اپنے دَرپئے آزار ہو گئے

پھُوٹی سحر تو چھینٹے اُڑے دُور دُور تک
چہرے تمام شہر کے گُلنار ہو گئے

○

کب سے ہے تیری کھوج میں اے صبحِ بے نشاں
بے چہرہ ساعتوں کا تھکا ہارا کارواں

خود سے ہی باندھ لو کوئی پیمانِ دوستی
ڈھونڈو گے اِس سفر میں کوئی ہم سفر کہاں

آنکھیں کروں میں بند تو ڈستی ہے تیرگی
دیکھوں تو چُبھنے لگتی ہیں خوابوں کی کرچیاں

آیا نسیمِ صبح کی صورت وہ شہر میں
کھلنے لگیں اُداس مکانوں کی کھڑکیاں

مانا کہ تا ابد نہیں جائے گی اُس کی باس
لیکن وہ پھول ایسا بدن آئے تو یہاں

جب پَو پھٹی تو کہنے لگی اوس کی رِدا
سب چل دیئے گھروں کو مگر جاؤں میں کہاں؟

نکلے تری تلاش میں ہم کچّی برف پر
پٹڑی کے ساتھ بنتے گئے پاؤں کے نشاں

○

بادل برس کے کھُل گیا رُت مہرباں ہوئی
بوڑھی زمیں نے تن کے کہا: میں جواں ہوئی

مکڑی نے پہلے جال بُنا میرے گِرد، پھر
مونس بنی، رفیق بنی، پاسباں ہوئی

شب کی رکاب تھام کے وہ یوں ہوئی جُدا
دِن چڑھتے چڑھتے بسری ہوئی داستاں ہوئی

کرتے ہو اب تلاش ستاروں کو خاک پر
جیسے زمیں، زمیں نہ ہوئی آسماں ہوئی

چھاؤں کا ایسا قحط پڑا اس برس کہ دھوپ
ہر سُو کھتے شجر کے لئے سائباں ہوئی

گیلی ہوا کے لمس میں کچھ تھا وگرنہ کب
کلیوں کی باس گلیوں کے اندر رواں ہوئی

آنا ہے گر تو آؤ کہ چلنے لگی ہوا،
کشتی سمندروں میں کھُلا بادباں ہوئی

بدلا زمانہ ایسا کہ ہونٹوں پہ تیرے بات
آئی ابھی نہیں تھی کہ وردِ زباں ہوئی

○

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے
بے وجہ کیوں ہوا کی طرح دربدر رہے

تُو بھی غلط نہیں ہے مگر اس قدر بتا
اپنے سوا وہ اور کا کیوں ہم سفر رہے

اُلجھے وہ تیرگی سے، ڈرے اپنے آپ سے
کہنے کو چاندنی کی رِدا اوڑھ کر رہے

آواز کے بھنور میں گراؤ تو چُپ رہے
چُپ کی گپھا میں لاؤ تو وہ بول کر رہے

سر سے اُتارے برف کی دستار کس طرح
بُوڑھے سے اِک پہاڑ کی صوُرت اگر رہے

جز گرد کائنات نہیں کچھ تو کیا اُسے
اِس گرد میں خراب وہ کیوں عمر بھر رہے

ہر لمحہ جیسے اوک لبالب بھری ہوئی
اور دِل تمام عمر یُونہی بے خبر رہے؟

○

فقط اِک سانس اپنی ہم نوا ہے
وگرنہ کون باقی رہ گیا ہے

خفا مُدّت سے ہے آواز تیری
ٹپکتی آنکھ میری لب کُشا ہے

کہاں جاؤں کہ سب جانب ہیں آنکھیں
مرا تن جن سے چھلنی ہو گیا ہے

وہ رُت جب لوٹ کر آئی تو دیکھا
مکیں غائب، مکاں خالی پڑا ہے

ستاروں کے جلے کھیتوں میں کون اب
جُھکی پلکوں سے موتی چُن رہا ہے؟

خبر اخبار میں، پھر جگ ہنسائی
یہ کیسی موت کوئی مر گیا ہے!

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

کہتے ہو تُم کہ خود میں سمٹنے لگی ہے شام
بھیگے پَروں کے ساتھ جھپٹنے لگی ہے شام

آنسو، ستارے، جُگنو، لرزتے ہوئے چراغ
لاکھوں چمکتی کرچوں میں بٹنے لگی ہے شام

صدیوں کے اِک سفر سے جو لَوٹی تو بے طلب
میری سیہ قبا میں سمٹنے لگی ہے شام

شاید مری طلب سے وہ ناآشنا نہیں
کانٹا سا بن کے تن سے چمٹنے لگی ہے شام

کاسہ سے آفتاب کے بھر کر لہو کا جام
دامانِ آسماں پہ اُلٹنے لگی ہے شام۔

○

کبھی کانٹوں پہ موتی بو گئے ہو
کبھی چُپ چاپ مٹّی ہو گئے ہو

گھنے جنگل میں گُم رستہ ہُوا ہے
بھری محفل میں تنہا ہو گئے ہو

سُنو تم صُبح کی دستک کا نغمہ
کہاں تاریکیوں میں کھو گئے ہو

کرن تو ہر بُنِ مُو سے اُڑی ہے
تمہیں بے دست و پا سے ہو گئے ہو

زمانے کی نہ لائے تاب تُم بھی
گِرا کر اپنی پلکیں سو گئے ہو

ہزاروں بار پہلے بھی گِرے تُم
مگر اِس بار پتھر ہو گئے ہو

○

منظر تھا راکھ اور طبیعت اُداس تھی
ہر چند تیری یاد مرے آس پاس تھی

میلوں تلک تھی جھلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

اُٹھے نہا کے شعلوں میں اپنے تو یہ کھلا
دونوں جہاں میں پھیلی ہوئی تیری باس تھی

کیسے کہوں کہ مَیں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ ، زمیں بے لباس تھی

اب دھول میں اَٹے ہوئے رستوں پہ ہے سفر
وہ دِن گئے کہ قدموں تلے نرم گھاس تھی!

○

کیا حادثہ ہُوا کہ بکھرنے لگی ہے شام
بہروپ خشک پھُول کا بھرنے لگی ہے شام

سُورج کی گرم مُٹھّی سے نکلی تھی اور اب
کِس کی گُداز گود میں گرنے لگی ہے شام

ماتھے پہ دِن کے زخم سا دیکھا تو دوڑ کر
اُس زخم کے شگاف کو بھرنے لگی ہے شام

ہر ہر قدم پہ میری طرف مُڑ کے دیکھتی
زینے سے پتھروں کے اُترنے لگی ہے شام

آگے ہو جیسے قلزمِ تاریک کا سفر
کشتی میں پاؤں دھرتے ہی ڈرنے لگی ہے شام

آدھے قمر کے سامنے تاروں کے رُو برُو
پھر وعدہ لَوٹ آنے کا کرنے لگی ہے شام

○

شب کٹ چکی تھی اور سحر کا پتا نہ تھا
ہونے میں اور نہ ہونے میں، کچھ فاصلہ نہ تھا

جھکنے لگا تھا شہر کا مینار اور ہم
ایسے ڈرے کہ قدموں تلے راستہ نہ تھا

آواز میں مٹھاس بھی تھی اشتعال بھی
ساگر بجھے دلوں کا مگر ڈولتا نہ تھا

تُو کب تھا کُلبلاتے ہوئے اُس ہجوم میں
پتھر اُٹھا کے تُو تو مجُھے مارتا نہ تھا

وہ دِن بھی تھے کہ ساری زمیں ریگ زار تھی
یہ خار دار بول کوئی بولتا نہ تھا

جھونکے سے بھی ہَوا کے میں اب ٹُوٹنے لگا
وہ دِن کہاں کہ جُھکتا تھا میں ٹُوٹتا نہ تھا

○

چھینٹا سا اوس کا مجھے بیدار کر گیا
سارے گھروندے خواب کے مسمار کر گیا

چڑیوں کا شور سُن کے طبیعت چہک اُٹھی
باتوں کا زہر جسم کو بیمار کر گیا

کب سے ہے تُو سفر میں مگر اس قدر بتا
طے کتنا فاصلہ ترا رہوار کر گیا؟

بادل سے بھی نہ ختم ہُوا دُکھ کا سلسلہ
وہ غم گُسار کوششِ بسیار کر گیا

تھا میں ہی چھیننے پہ مُصر ورنہ قُفلِ غم
کس دَر کو ایک پَل میں نہ دیوار کر گیا

میں نے یہ کب کہا تھا کہ آ دوستی کریں
وہ سنگ دل تو ایسے ہی انکار کر گیا

خُود تو چلا گیا کہ اُسے کام تھے بہت
مُجھ کو سپُردِ پنجۂ اغیار کر گیا

○

مانا کہ تیز آگ کی حدت ہوا میں ہے
لیکن وہ ایک برف کی سِل جو قبا میں ہے

مَیں جانتا ہُوں لوہے کی زنجیر تُو نہیں
جھنکار سب کی سب مری آواز پا میں ہے

سینے کے بند سیپ میں اک راز تھا سو آج
پلکوں سے ٹوٹتی ہوئی مدھم صدا میں ہے

وہ لمحہ جس نے روک لیا تھا اُسے کبھی
ٹھہرا ہوا وہ لمحہ ابھی تک خلا میں ہے

کیسے اُڑوں کہ خاک نہیں چھوڑتی مجھے
کیوں کر رُکوں کہ تازہ لہُو دست و پا میں ہے

جی چاہتا ہے نذر کروں آج پھر تجھے
وہ پَرِ شکستہ گُل کہ دلِ نا رَسا میں ہے

ہر چند تیرا رنگ ہے پھُولوں میں جا بجا
رفتار میری موجۂ بادِ صبا میں ہے

○

ہے سچ اگر کہ رنگوں کا طوفان ٹل گیا
گالوں پہ تیرے کون یہ سُرخی سی مَل گیا

اِک سِل تھی برف کی کہ سدا روبرُو رہی
کہسار گرد ہو گئے لوہا پگھل گیا

چِھن بھر کو چاندنی کی رِدا نے چُھوا مجُھے
نفرت سے ماہتاب کا چہرہ بدل گیا

دِن کو رہا میں اپنے ہی سائے سے بدگماں
شب آ گئی تو اپنے ہی سائے میں ڈھل گیا

بادل کو دیکھتے ہی لگی تن بدن میں آگ
جب تک پھوار آئے بھرا شہر جَل گیا

چلتا رہا ہوں اپنی ہی جانب تمام عُمر
تُو نے غلط کہا کہ میں گھر سے نِکل گیا

گھبرا کے میں نے دیکھا تھا اُڑتے پرند کو
تُو سوچنے لگا کہ مرا دِل مچل گیا

کبھی کبھی وہ نظر مجھ سے بھی مِلاتا ہے
وگرنہ اپنی ہی آنکھوں کے دُکھ اُٹھاتا ہے

چلے بھی آؤ کہ سب روگ اب تمام ہوئے
خود اپنا بوجھ کہاں تک کوئی اُٹھاتا ہے

وہ تشنگی ہے کہ دُکھتے ہیں میرے ہونٹ اگر
پلک سے اوس کا قطرہ ہمک کے آتا ہے

تُو نا سمجھ تھا کہ دہلیز تک چلا آیا
زمانہ اب تجھے بازار میں بُلاتا ہے

ہوں خُشک ریت کا صحرا تو میری خاطر کیوں
سنہری بجرے خیالات کے بہاتا ہے؟

نشانِ میل کی صُورت ہوں رہگزر کے قریں
یہ کارواں مجھے چھُو کر گزُرتا جاتا ہے

میں روشنی کی طرح ہوں ہر اک جگہ موجُود
یہ دیکھتا ہُوں تُو خود کو کہاں چھُپاتا ہے!

یہ چشمِ نم وہ لرزتے لبوں سے روز مجھے
ہزار بار کہانی وہی سناتا ہے

اتر کے اوجِ فلک سے مری نگاہوں میں
تمام رات ستارہ مجھے جگاتا ہے

○

ترے جہاں میں کوئی پُر فشاں نہیں مِلتا
کہیں بھی لکۂ ابرِ رواں نہیں مِلتا

چمکتے تاروں کا وہ ازدحام ہے کہ مجھے
تلاش کرنے پہ بھی آسماں نہیں مِلتا

پلک اُٹھاؤ تو نیلے سمندروں کا خروش
پلک گراؤ تو کچھ بھی یہاں نہیں مِلتا

ہَوا چلی تو چہکنے لگے لبوں کے پرند،
ہَوا رُکی تو کوئی مہربان نہیں مِلتا

یہ کیا کہ آنکھوں کے پَٹ تو کُھلے ہیں اور کہیں
ترے وجُود کا نام و نِشاں نہیں مِلتا

جو آ کے میرا ہی منظر مجھے دِکھا جائے
وہ یارِ مخلص و نامہربان نہیں مِلتا

سجا کے آنکھ میں آنسُو نہ اِس قدر اِترا
بھرے جہاں میں یہ گوہر کہاں نہیں مِلتا

دھار سی تازہ لہو کی شبنم افشانی میں ہے
صُبح دم بھیگی ہوئی پلکوں کی تابانی میں ہے

آنکھ ہے لبریز جیسے رو پڑے گا تو ابھی
جیسے ذلّت کا مُداوا آنکھ کے پانی میں ہے

میں نہیں ہارا تو میرے حوصلے کی داد دے
اِک نیا عزمِ سفر اس خستہ سامانی میں ہے

بے ثمر، بے رنگ موسم برف کی صُورت سفید
اور دلِ اُمڈے ہوئے رنگوں کی طُغیانی میں ہے

آگ ہے سینے میں تیرے موجزن تو یاد رکھ
شمع سی روشن اندھیرے گھر کی ویرانی میں ہے

انگنت رنگوں کے پَر بکھرے پڑے ہیں ہر طرف
وقت کا گھائل پرندہ پھر سے جولانی میں ہے

کس گھنے جنگل میں جا کر اب چُھپیں اہلِ وطن
آنکھ سی اُبھری ہوئی سُورج کی پیشانی میں ہے

○

آیا وہ تیرے پاس جو خُود سے جُدا ہُوا
چہرہ سا اِک لگا کہ ترا ہم نوا ہُوا

وہ برگِ سبز جس کو اُڑا لے گیا تھا تُو
ڈھونڈا تو مِل گیا مجھے بَن میں پڑا ہُوا

شبنم سے اپنی پلکوں کو اتنا بھگو کہ میں
سوچوں کہ ایک سُوکھا شجر پھر ہرا ہُوا

اُوپر مجھے ستاروں کی بکھری ہوئی تھی راکھ
نیچے گھنے درختوں کا جنگل جلا ہُوا

میری طرف نگاہ اُٹھا اور غور کر
کب سے ہوں تیری راہ کا پتھر بنا ہُوا

آواز کے بھنور میں مجھے مت گرا کہ مَیں
کرنوں کا جال توڑ کے کل ہی رہا ہُوا

کرنا پڑے گا اپنے ہی سائے میں اب قیام
چاروں طرف ہے دھوپ کا صحرا بچھا ہُوا

○

شبِ سیاہ میں جس طرح کاہکشاں آباد
سدا رہے یہ تیری شامِ دوستاں آباد

عجیب رنگ ہے اب کے خروشِ دریا کا
ہے سطحِ آب پہ اِک شہرِ بے نشاں آباد

کھُلے کواڑ ہیں آنکھوں کے اور سناٹا
کبھی تو تم بھی کرو یہ حسیں مکاں آباد

میں جانتا ہوں کہ پہلے کھلا تھا عرش پہ تو
پھر اُس کے بعد کیا تُو نے یہ جہاں آباد

بنائے تو نے ستاروں سے گھر ہزاروں بار
مگر ہوا نہ کبھی تجھ سے آسماں آباد

اُڑی جو گرد تو اس خاک داں کو پہچانا
کھُلا کہ خاک سے تھا سارا خاک داں آباد

چلو کہ ہم بھی شفق زار میں کہیں بیٹھیں
چلو کہ ہم بھی کریں شامِ خستگاں آباد

○

مانا ستارے شب کے سدا جگمگائیں گے
بھڑکی چتا سحر کی تو کیا جل نہ جائیں گے؛

اُجلی ہوا میں ہم نے دیا ہے پروں کو کھول
اب جس طرف بہے گی ہوا بہتے جائیں گے

آنکھوں میں صَف دُکھوں کی بچھانے کا فائدہ
ہم نے ترا فریب نہ کھایا نہ کھائیں گے

میری قبا بھی دے نہ سکے گی تجھے پناہ
جب بادلوں کے اسپ سیہ فام آئیں گے

دہلیز بھی عبور نہ کر پائے جو کبھی ،
کیسے وہ اب پہاڑ کے اُس پار جائیں گے؟

ہے شرط چشمہ پھوٹ کے نکلے زمیں سے
لاکھوں پرند پیاس بجھانے کو آئیں گے

چھٹکی جو چاندنی تو چٹخنے لگیں گے ہم
اور گفتگو کے پھول سحر تک کھلائیں گے

○

قابو ہی میں گر وقت کا رہوار نہیں ہے
مَیں کیسے کہوں راستہ ہموار نہیں ہے

سر پر نہیں شمشیرِ برہنہ کی طرح دھوپ
یا قدموں تلے سلسلۂ خار نہیں ہے؟

آواز تو آتی ہے مگر رُک نہیں پاتی
کیا شہر میں تیرے کوئی دیوار نہیں ہے؟

مَیں بھی تو مُصر ہوں کہ ہَوا ان کے اُڑوں میں
اور پھُول کی خُوشبو کو بھی انکار نہیں ہے

مانوس نہیں تُم سے رہا ہو گا وگرنہ،
پالے ہُوئے پنچھی کی یہ چہکار نہیں ہے

کیسے نظر آئے مجُھے صُورت وہ شناسا
دریا بھی تو اب آئینہ بردار نہیں ہے

مانا کہ سبھی اہلِ زمانہ ہوئے بیمار
ہے تُجھ کو یقیں آپ تو بیمار نہیں ہے

○

بیتی باتوں سے مجھے بہلا نہیں
اے زمانے اَلوٹ کر اَب آ نہیں

ہم ورَق چاندی کے ۔ اے پاگل ہَوا
بھُول کر بھی ہم سے تُو ٹکرا نہیں

چل پڑے تو کٹ ہی جائے گا سفر
اے مری آوازِ پا گھبرا نہیں

مُٹھیاں بھر بھر کے بے دردی سے تُو
اپنی خاکستر کو یُوں بکھرا نہیں

چھیڑ مت جانے کا قِصّہ بار بار
کہکشاں کی رہگزر دِکھلا نہیں

رات بھر کہتا رہا جُگنُو سے مَیں
ٹھوکریں یُوں ہر قدم پر کھا نہیں

رو اگر مرغوب ہے رونا تجھے
آنکھ سے چنگاریاں برسا نہیں

ستم ہوا کا اگر تیرے تن کو راس نہیں
کہاں سے لاؤں وہ جھونکا جو میرے پاس نہیں

پگھل چکا ہوں تمازت میں آفتاب کی مَیں
مرا وجود بھی اب میرے آس پاس نہیں

مرے نصیب میں کب تھی برہنگی اپنی
ملی وہ مجھ کو تمنّا کہ بے لباس نہیں

کسے خبر کہ کہاں چھوڑ کر چلی جائے
صبا کے چال چلن سے تو رُو شناس نہیں

کھُلا پڑا ہوں ہوا میں کتاب کی صُورت
وہی پڑھے مجھے آ کر جو ناسپاس نہیں

لہُو کے ساتھ گئی تن بدن کی سب چہکار
چُبھن کرن میں نہیں ہے کلی میں باس نہیں

○

وہ کون تھا جو خُون کے دھارے میں بہہ گیا
زخموں کی ایک باڑ سی چہرے پہ سہہ گیا

مجُھ کو نہ روک میری نظر منزلوں پہ ہے
خُود کو اُٹھا کر تُو میرے قدموں میں رہ گیا

ریگِ رواں سے پھُوٹ کے نکلے کنول ہزار
جاتے ہوئے وہ بات عجب مجُھ سے کہہ گیا

پتھر کا وہ مکاں کہ تجھے جس پہ ناز تھا
شبنم کی ایک بوند گری اور بہہ گیا

موتی بنا تو ڈوب گیا اُس نگاہ میں
ذرّہ بنا تو وقت کا ہر وار سہہ گیا

○

رات کے سیپ سے جب دُر درہا ہوتا ہے
صُبح دم سینکڑوں پلکوں پہ سجا ہوتا ہے

زخم دروازہ نہیں ہے کہ مقفل کر لیں
زخم ہر حال میں آغوش کُشا ہوتا ہے

وہ کبھی نیلا سمندر ہے کبھی سبز زمیں
کبھی موجوں کبھی پھُولوں میں گھرا ہوتا ہے

ہم نے خود دیکھے ہیں آواز کے اُڑتے ہوئے رنگ
کوئی آنسو اُسے جب چھیڑ رہا ہوتا ہے

گرد اُڑتی ہے تو اٹ جاتے ہیں اشجار تمام
اوس گرتی ہے تو اِک حشر بپا ہوتا ہے

روگ پھر روگ ہے پتھر کو بھی لگ سکتا ہے
درد دِل میں کبھی تیرے بھی بپا ہوتا ہے!

کم نہیں کرب کی لہروں کا تناؤ لیکن
چاند نکلے تو یہ طوفان سوا ہوتا ہے

آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے
جو بچ گئے وہ آپ ہی شاخوں پہ سڑ گئے

کیا قہر ہے کہ پہلے لکھو خود لہو سے نام
پھر چیخ کر کہو کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

میلا ہوا فلک تو چمکنے لگی ہوا
ساگر کے رُخ پہ کتنے شکن اور پڑ گئے

آخر پلٹ کے شام نے دیکھا مری طرف
کرنوں کے تیر میری ہتھیلی میں گڑ گئے

سُننا پڑی جو اُس کو مری داستانِ غم
عارض کی سِل پہ کتنے نگینے سے جڑ گئے

○

مرے راستے میں جو پتھر پڑا ہے
نگینے کی صورت زمیں میں جڑا ہے

یہ کیا ہو گیا ہے کہ میرا ہی سایہ
مرے جسم سے کٹ کے اوندھا پڑا ہے

جدھر دیکھتا ہے ہوا رُو برو ہے
یہ دل زرد پتے کی صورت کھڑا ہے

اندھیرے کی گلیاں بہت تنگ دل ہیں
اُجالے کا میدان کتنا بڑا ہے

وہی رہ نوردی وہی رُوسیاہی
وہی اِک مسافر کہ ضِد پر اَڑا ہے

کبھی اپنے اندر رہا قید برسوں
کبھی مُدتوں آسماں سے لڑا ہے

لڑھکتے ہُوئے پتھروں کو بتاؤ
ہمالہ جہاں تھا وہیں پر کھڑا ہے

○

تُو گُم پڑا ہے اپنے خیالوں کی دُھول میں
مَیں کیوں تجھے تلاش کروں پھُول پھُول میں

آئی تھی اِک صدا کہ چلے آؤ ——— اور میں
صحرا عبور کر گیا شوقِ فضُول میں

جَھپٹے وہ مجھ پہ تول کے گُندے ہزار بار
خود کو لہُو لہان کیا اپنی بھُول میں

آئے تو ہو مگر نہ قریب آؤ اس طرح
موتی سجا کے لاؤ نگاہِ ملول میں

اِک بار ہم نے پار کیا چُپ کا ریگزار
پھر عمر بھر اَٹے رہے لفظوں کی دھول میں

○

صُورت سے آشنا تھا مگر جانتا نہ تھا
پہچان کر بھی مجھ کو وہ پہچانتا نہ تھا

مر جائے گی ہوا مجھے اس کا گماں نہ تھا
تھک جائے گی صدا میرا جی مانتا نہ تھا

آخر اُسی نے تجھ پہ نچھاور کیا لہُو
وہ شخص جس کو اپنا تو گردانتا نہ تھا

وہ دِن بھی یاد کر کہ بھرے شہر میں یہاں
تیرے سوا کوئی بھی تجھے جانتا نہ تھا

مَیں خوش کہ مِل سکا تجھے اِک اجنبی کی طرح
تُو مطمئن کہ میں تجھے پہچانتا نہ تھا

چمن میں آ کے عجب اپنے دِل کا حال ہُوا
نئی رُتوں کا تماشہ بھی اِک وبال ہُوا

ترا کمال تو یہ تھا کہ آنکھ لَو دیتی
جلے چراغ بُجھانا ترا کمال ہُوا

بُٹے گا خشک جزیروں میں ایک دِن وہ بھی
مِلن تمہارا ہمارا اگر محال ہُوا!

وہی ہے ساعتِ مُردہ وہی در و دیوار
بُرے دِنوں کو گئے آج پُورا سال ہُوا

کرن کی نوک سے کٹنے لگا تمام بدن
سنہری دھُوپ میں آ کر یہ اپنا حال ہُوا

سفر کا رُخ ہے تمہاری طرف وگرنہ مجھے
پلٹ کے جانا کبھی باعثِ ملال ہُوا

ہٹاؤ رات کا قصہ، سحر کی بات کریں
وہ چشمِ صُبح کھُلی، مُنہ شفق کا لال ہُوا

بادل چھٹے تو رات کا ہر زخم وا ہُوا
آنسو ذرا رُکے تھے کہ محشر بپا ہُوا

سُوکھی زمیں پہ بکھری ہوئی چند پتّیاں
کچھ تو بتا نگارِ چمن تجھ کو کیا ہُوا

ایسے بڑھے کہ منزلیں رستے میں بجھ گئیں
ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لَوٹنا ہُوا

اے جُستجو! کہاں گئے وہ حوصلے ترے
کِس دشت میں خراب ترا قافلہ ہُوا

پہنچے پسِ خیال تو دیکھا کہ ریت پر
اک پھول کی طرح تھا وہ خیمہ کھِلا ہُوا

آئی شبِ سیہ تو دیے جھلملا اُٹھے
تھا روشنی میں شہر ہمارا بجھا ہُوا

○

وہ دِن کہاں کہ ریت کے اندھے غُبار میں
تُم رُک گئے تھے میرے دلِ سوگوار میں

بکھرا پڑا تھا سارے چمن میں مرا بدن
تُو نے پرو لیا کِسے پھُولوں کے ہار میں

اِک ایک کر کے بجُھتی گئیں مَشعلیں تمام
اب تیلیاں جلاتے پھرو تیرہ غار میں

آندھی کے پنکھ پھیل گئے آسمان پر
اِک رنگ زار بچھنے لگا لالہ زار میں

تُم گود سے زمین کی اُترے تو ہو مگر
کھیلو گے ساتھ کس کے خلا کے غُبار میں؛

دیکھا تو خوں میں لتھڑے پڑے تھے شجر تمام
نیزے گڑے ہوئے تھے ہر اِک شاخسار میں

جاؤ گے اب کہاں کہ زمانہ ہی رُک گیا
دیکھو غُبار تھم سا گیا رہگزار میں

گر ہم سے نہیں یہ گفتگو ہے
کیوں روئے سخن ہماری سُو ہے

مت اُس سے اُلجھ کہ وہ بھی آخر
پہنچے گا وہیں جہاں کہ تُو ہے

مَیں کیسے کروں تلاش تجھ کو
چہروں کا ہجوم رُو برُو ہے

بنجر ہے اگر پہاڑ یکسر
آئی یہ کہاں سے آب جُو ہے؟

اے میری دُکھی صدا ذرا سُن!
آواز سی کیا یہ سُو بہ سُو ہے!

بستی ہے کہ اِک گھنا سا جنگل
جنگل ہے کہ شہرِ تُند خُو ہے

دھن اپنا لُٹائے رات بھر وہ
شبنم کی اسی میں آبرُو ہے

تجھ سا بھی کوئی تو ہو گا آخر
مجھ ایسا اگر وہ ہُو بہُو ہے

○

آنکھ میں تیری اگر صحرا نہیں
حال پر میرے تو کیوں رویا نہیں

جانتا ہوں صبح کا تارا ہے تو
میری خاطر تو کبھی جاگا نہیں

دستکیں ہی دستکیں ہیں ہر طرف
آدمی اک بھی نظر آتا نہیں

میں صدا دوں اور تو آواز دے
اس بھری دنیا میں ممکن کیا نہیں

ہے ترے اندر ترا ہم شکل قید
وہ جسے تو نے کبھی دیکھا نہیں

رو رہا ہوں ایک مدت سے مگر
آنکھ سے آنسو کوئی ٹپکا نہیں

O

پہلا ہی گرم لُو کا تھپیڑا نہ سہہ سکی
کہنے کو کشتِ دل تھی ازل سے ہری بھری

پھر ہے تجھے تلاش اُسی ایک شخص کی
کترا کے جس سے مثلِ صبا تُو نے راہ لی

دیوار گر نہیں ہے تو چادر ہی اوڑھ لے
ننگے بدن کی ڈھال تو کاغذ کی ہے بنی

جنگل کی سمت آئے ہو صحرا کو چھوڑ کر
گھر کا یہ راستہ تمہیں بھُولا نہ تھا کبھی؟

ہوتا ہے ذکر گلیوں میں اب آسمان کا
اندھوں کے بند شہر میں کیسی ہوا چلی

جھونکوں نے تار تار کیا پَو پھٹے کا خواب
کن پاگلوں کے ہاتھ ہماری قبا لگی!

وہ عہدِ ابر و باد تو موسم کا کھیل تھا
نکلا جو آفتاب تو گرمی بہت پڑی

○

روک کر خُوشبو نے میرا راستہ مجُھ سے کہا
اے ہوا کے سرد جھونکے چھوڑ کر مجُھ کو نہ جا

لڑکھڑاتے، کانپتے لفظوں میں تُو نے بات کی
کھو دیا تُو نے کہاں سیلِ رواں آواز کا

دِل زدوں کا امتحاں لیتی رہی زنجیرِ صُبح
کاروانِ شب کا لیکن سِلسلہ جاری رہا

گرم گفتاری سے میری موم تو پانی ہوا
آنکھ سے تیری مگر پگھلا نہ دریا برف کا

کیا خبر تھی تُو بھی ستّارہ بنے گا ایک دِن
ایک ہی مرکز سے ہو گا تیرا میرا سِلسلہ

در پہ اُس کے دستکیں تھیں مضطرب لیکن وہ شخص
اپنی ہی آواز کے آہنگ میں کھویا رہا

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہیئے
ہر طرف پھُولوں کا سونا ہے یہاں بِکھرا ہُوا

○

بے صدا ، دم بخود فضا سے ڈر
خُشک پتّہ ہے تُو ، ہَوا سے ڈر

کورے کاغذ کی سادگی پہ نہ جا
گُنگ لفظوں کی اِس ردا سے ڈر

آسماں سے نہ اِس قدر گھبرا
تُو زمیں کی سزا جزا سے ڈر

جانے کس کھونٹ تجھ کو لے جائیں
شاہ زادے! نقوشِ پا سے ڈر

ترکِ دستِ طلب پہ مت اترا
اپنے دل میں چھپے گدا سے ڈر

اُس کے ہاتھوں سے بچ سکا ہے کون
خود کو جھوٹے نہ دے دلاسے، ڈر

ڈر صداؤں سے مت، کہا تھا تجھے
اب تو اپنی صدائے پا سے ڈر

عرش تک بھی اڑان ہے اپنی
ہم پرندوں کی بددعا سے ڈر

آرزو اک نئے جنم کی نہ کر
اتنی لمبی کڑی سزا سے ڈر

○

دُکھ بھری اپنی کہانی جو سُنا دی ہم نے
دیکھ اے شخص! تجھے کیسی سزا دی ہم نے

کیا عجب آئے اِدھر بھی وہ ہَوا کا جھَونکا
گھر کی دہلیز پہ اک شمع جلا دی ہم نے

بانسری بول رہی تھی کہ اِدھر آ جاؤ
اُس کی آواز میں آواز ملا دی ہم نے

بات بس یہ تھی کہ ہم پھولوں سے مسمار ہوئے
لے تجھے اتنی سی یہ بات بتا دی ہم نے

ہم نے گر توڑ ہی ڈالے تھے وہ بندھن تو بتا
ہر کڑے وقت میں کیوں تجھ کو صدا دی ہم نے؟

بے خطا ہے تو اُسے کیوں ہے ندامت اتنی
اپنے ہی گھر کو اگر آگ لگا دی ہم نے

دیکھئے ملتی ہے اب اُس کو سزا یا کہ جزا
تیرے انصاف کی زنجیر ہلا دی ہم نے

اب تو یوں لگتا ہے اے گردشِ پیہم جیسے
عُمر ساری کسی خیمہ میں بِتا دی ہم نے

○

سفر تمام ہوا اور جہان باقی ہے
رُکو نہیں کہ ابھی آسمان باقی ہے

چلو مٹا دیے سارے نشانِ پا تُو نے
بیاضِ دل پہ یہ کیسا نشان باقی ہے

کرم کرے نہ کرے اور صدا سُنے نہ سُنے
یقین ختم ہوا ، اب گمان باقی ہے

پہاڑ، ابر، ستارہ، کلی، ہَوا، خوشبو
ہے کون جس کا یہ طرزِ بیان باقی ہے

مرے بدن میں مکیں ہے ابھی تری خوشبو
مکاں کے ساتھ ابھی لامکان باقی ہے

سخن کے ٹوٹ چکے اُس سے سلسلے سارے
بس ایک رنجشِ لب، درمیان باقی ہے

نہ چھت رہی ہے نہ چھتنار، پھر بھی کہتے ہو
فلک کا سر پہ ابھی سائبان باقی ہے

ابھی سے جانے لگے ہو ذرا ٹھہر جاؤ
ابھی پہاڑ سی یہ داستان باقی ہے

تکان نام اسی کیفیّت کا ہے شاید
لہو بدن میں نہیں اور جان باقی ہے

○

لُٹا کر ہم نے پتّوں کے خزانے
ہَواؤں سے سُنے قصّے پُرانے

کھلونے برف کے کیوں بن گئے ہیں
تمہاری آنکھ میں اشکوں کے دانے

چلو اچھا ہُوا بادل تو برسا
جلایا تھا بہت اُس بے وفا نے

یہ میری سوچتی آنکھیں کہ جن میں
گزرتے ہی نہیں گزرے زمانے

بگڑنا ایک پل میں اس کی عادت
لگیں صدیاں ہمیں جس کو منانے

ہوا کے ساتھ نکلوں گا سفر کو
جو دی مہلت مجھے میرے خدا نے

بتا کس نے کیا پاگل گلی کو
سلگتی شاخِ صندل نے ؟ حنا نے ؟

سرِ مژگاں وہ دیکھو جل اٹھے ہیں
دیے جتنے بجھائے تھے ہوا نے

○

اس گریۂ پیہم کی اذیّت سے بچا دے
آوازِ جرس! اب کے برس مجھ کو ہنسا دے

یا ابرِ کرم بن کے برس خُشک زمیں پر
یا پیاس کے صحرا میں مجھے جینا سکھا دے

مَیں بھی تری خوشبو ہوں مری سمت بھی تُو دیکھ
مہلت تجھے گر سلسلۂ موجِ صبا دے

سُورج نے مجھے برف کیا ہے تو تجھے کیا
کیا تجھ کو اگر برف مجھے آگ لگا دے

ایسا بھی نہیں ہے کہ فقط خاک نشیں ہوں
آجائے ہَوا آ کے مری خاک اڑا دے

خوشبو کی طرح دربدری خُو ہو مری گر
بے شک تو مجھے میری نگاہوں میں گرا دے

کانٹے کی جراحت سے بھی مر جاتے ہیں کچھ لوگ
رکھ حوصلہ، اتنی بھی نہ اب خود کو سزا دے

یا ربّ! تیری رحمت کا طلب گار ہے یہ بھی
تھوڑی سی مرے شہر کو بھی آب و ہَوا دے

کیا تیرا بگڑتا ہے اگر چاندنی شب تُو
اک بار مجھے پھر میری آواز سُنا دے

○

گُل نے خوشبو کو تج دیا نہ رہا[1]
خود سے خود کو کیا جُدا نہ رہا

رات دیکھے سفر کے خواب بہت
پَو پھٹی جب تو حوصلہ نہ رہا

قافلہ اُس کے دم قدم سے تھا
چل دیا وہ تو قافلہ نہ رہا

---

[1] مشتاق قمر کی یاد میں

ربط اُس کا زماں سے کیا رہتا
جب زمیں ہی سے سلسلہ نہ رہا

ترک کر خامشی کا مسلک ، سُن
ہوگیا جو بھی بے صدا نہ رہا

عُمر بھر اس نے بے وفائی کی
عُمر سے بھی وہ باوفا نہ رہا

آنکھ کھولی تو دُوریاں تھیں بہت
آنکھ میچی تو فاصلہ نہ رہا

کس کی خوشبو نے بھر دیا تھا اُسے
اُس کے اندر کوئی خلا نہ رہا

○

خود سے ہُوا جُدا تو ملا مرتبہ تجھے
آزاد ہو کے مجھ سے مگر کیا ملا تجھے

اک لحظہ اپنی آنکھ میں تُو جھانک لے اگر
آئیں نظر یں بکھرا ہُوا جا بجا تجھے

تھا مجھ کو تیرا پھینکا ہُوا پھُول ہی بہت
لفظوں کا اہتمام بھی کرنا پڑا تجھے

یہ اور بات مَیں نے صدائیں ہزار دیں
آئی نہ دشتِ ہول سے اک بھی صدا تجھے

تُو نے بھی خود کو مرکزِ عالم سمجھ لیا
لگ ہی گئی زمانے کی آخر ہَوا تجھے

کیا قہر ہے کہ رنگوں کے اس ازدحام میں
جُز رنگِ زرد اور نہ کچھ بھی ملا تجھے

نظروں نے تار تار کیا آسماں تمام
آئی نہ راس تاروں بھری یہ ردا تجھے

دائم رہے سفر میں ترا ناقۂ خیال
دیتا رہوں مَیں روز یہی بددُعا تجھے

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عُمر ہی چلنا پڑا تجھے

○

تمہیں خبر بھی نہ تھی اور بزم شکستہ حال
تمہارے قدموں کی آندھی میں ہو گئے پامال

ترے بدن کی مہک نے سُلا دیا تھا مگر
ہوا کا اندھا مُسافر چلا انوکھی چال

وہ ایک نور کا سیلاب تھا کہ اُس کی نظر
وہ ایک نُقطۂ موہوم تھا کہ یہ بد حال

عجیب رنگ میں وارد ہوئی خزاں اَب کے
دَہکتے ہونٹ، سُلگتی نظر، دہکتے گال،

ترے کرم کی تو ہر سُو مہکتی برکھا تھی،
ہمیں تھے جن کو ہُوا بھیگا پیرہن بھی وبال

○

مٹی اُڑی تو پھولتی سرسوں کا دم گھٹا
شبنم گری تو سبز درختوں کا دم گھٹا

آنسو بھری نگاہ سے دیکھا تو کیا نہ تھا
چلمن اتر گئی تو مکانوں کا دم گھٹا

آواز دی تو ساتوں فلک جھک کے آ گئے
لب سی لیے تو دونوں جہانوں کا دم گھٹا

دیکھا تو سارا دشت ہی اک لالہ زار تھا
خوشبو گھنی تھی اتنی، ہواؤں کا دم گھٹا

کس کو خبر کہ کیسے ہوا رت جگا تمام
اور کیسے شب کے پنچھی کی چیخوں کا دم گھٹا

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور
چاندنی رات ترا ہی مُکھ ہے، ترا ہی رُوپ ہے بھور

کس بادل کا دامن تھام کے تیرے دیس سے جاؤں
تیرا قد آکاش سے اُونچا، لانبی تیری پور

تُو کندن سی اوس میں ڈھل کر بکھرے شام ڈھلے
چندا کے زینے سے اُترے آدھی رات کا چور

تُو سُورج کی آنکھ سے جھانکے پَل پَل وار کرے
میں اک پیڑ کی گھائل چھایا، میرا کس پر زور!

میں آوارہ، بھاگ کے تجھ سے، دیس بدیس پھروں
رُک جاؤں تو ہاتھ تمہارا کھینچے میری ڈور

شام اور سائے

شام کا تارہ دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
پنچھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں

ترتیب

دھرتی کی آواز	۱۹۴۶ء	۲۰۹	آخرِ شب	۱۹۵۵ء	۲۳۴
نوجوانی	۱۹۴۸ء	۲۱۱	من و تُو	۱۹۵۶ء	۲۳۶
تخلیق	۱۹۴۸ء	۲۱۳	بازگشت	۱۹۵۶ء	۲۳۸
دائرہ	۱۹۵۱ء	۲۱۵	انجام	۱۹۵۶ء	۲۴۰
ندامت	۱۹۵۱ء	۲۱۷	میں اور تُو	۱۹۵۷ء	۲۴۲
یاد	۱۹۵۲ء	۲۱۹	اکیلا	۱۹۵۷ء	۲۴۳
سرِراہ	۱۹۵۲ء	۲۲۱	فن کار سے	۱۹۵۷ء	۲۴۴
یہ لوگ	۱۹۵۳ء	۲۲۳	تعاقب	۱۹۵۷ء	۲۴۶
ننھے مزدور	۱۹۵۳ء	۲۲۵	زندگی	۱۹۵۸ء	۲۴۷
حیاتِ نَو	۱۹۵۴ء	۲۲۶	پرانی بات	۱۹۵۸ء	۲۴۹
نئی پود	۱۹۵۴ء	۲۲۸	جنگل	۱۹۵۸ء	۲۵۱
آوارہ	۱۹۵۴ء	۲۲۹	انسان	۱۹۵۸ء	۲۵۳
شبِ یلدا	۱۹۵۵ء	۲۳۱	مسرت	۱۹۵۸ء	۲۵۴
قریب و دُور	۱۹۵۵ء	۲۳۳	پت جھڑ	۱۹۵۹ء	۲۵۶

پیپل	۱۹۵۹ء	۲۵۸	نیا سال	۱۹۶۲ء	۲۸۶
عکس	۱۹۵۹ء	۲۶۰	نارسائی	۱۹۶۲ء	۲۸۷
رات	۱۹۵۹ء	۲۶۲	سرپھرا	۱۹۶۲ء	۲۸۸
بات	۱۹۶۰ء	۲۶۳	جسم	۱۹۶۲ء	۲۹۰
جب اور اَب	۱۹۶۰ء	۲۶۴	دُکھ	۱۹۶۲ء	۲۹۲
شام	۱۹۶۰ء	۲۶۶	چمکتا لمحہ	۱۹۶۲ء	۲۹۴
عشق	۱۹۶۰ء	۲۶۸	بلیک آؤٹ	۱۹۶۳ء	۲۹۷
طلسم	۱۹۶۰ء	۲۶۹	چیل	۱۹۶۳ء	۲۹۹
بُلاوا	۱۹۶۰ء	۲۷۱	گوری اور کالی	۱۹۶۳ء	۳۰۱
پیار	۱۹۶۰ء	۲۷۲	اُجڑتا شہر	۱۹۶۳ء	۳۰۳
فرازِ کوہ	۱۹۶۱ء	۲۷۴	تہذیب	۱۹۶۳ء	۳۰۵
بے وفا	۱۹۶۱ء	۲۷۶	عفریت	۱۹۶۳ء	۳۰۷
ملاقات	۱۹۶۱ء	۲۷۷	اعراف	۱۹۶۳ء	۳۰۹
سفر	۱۹۶۱ء	۲۷۹	مشورہ	۱۹۶۳ء	۳۱۱
اجنبی	۱۹۶۱ء	۲۸۱	چاپ	۱۹۶۴ء	۳۱۳
واپسی	۱۹۶۱ء	۲۸۳	رُکنے کے بعد	۱۹۶۴ء	۳۱۵

نروان : ۱۹۶۴ء ۳۱۷

نردبان

شعر کی تعریف میں لاکھ اصطلاحیں وضع ہوئیں، ساری باتیں درست، لیکن وزیر آغا کی ان نظموں کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا شعر ایک ایسی لطیف علامت ہے، جو ایک زندہ استعارے سے اُبھرتی ہے۔ علامت رُوحِ نظم ہے اور زندگی کی لہروں سے اُچھلتا ہوا استعارہ اس رُوح کا جسم ہے۔ علامت، ایک کنگرۂ ایواں، ہے، تو استعارہ زینۂ اظہار — نہیں، یہ ایوان و نردبان کی مثال بھی درست نہیں۔ زینہ تو کنارِ ایواں تک آکر رک جاتا ہے، یہاں کیفیت ہی دوسری ہے، — ان نظموں میں استعارے کے پھیلاؤ کے ہمراہ موضوع کا دائرہ بھی پھیلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی حدود، استعارے کی سرحدیں بھی متعین کرتی چلی گئی ہیں — ایک فکری خلا کو عبور کیا جا سکتا ہے، لیکن بات اظہار کی ہو تو ایک تاثر کو تمثیل بیان نہیں کر سکتی جب تک تمثیل، اس تاثر کو اپنے قالب میں ڈھال نہ لے، کہ تاثر کے اجزا اور تمثیل کے عناصر ایک ہو کر رہ جائیں اور ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے، کہ ان میں کائنات کے زندہ و متحرک مظاہر، اپنے

چہروں سے بوجھل نقاب اتار کر، میٹھے، سُبک، ملائم، مترنّم لفظوں کی بساط پر اُتر کر جیتے، جیالے، دھیمی دھیمی سانس لیتے ہوئے خیالوں کا جادو جگاتے ہیں۔ بات کہیں گہری، کہیں گمبھیر، کہیں چنچل ہے۔ اِس کی لانبی زلفیں سونے کے باریک مہین تاروں کی طرح لہراتی ہیں، آپس میں اُلجھتی نہیں، موضوع نازک ہیں، اَدَق نہیں، اشارے بلیغ ہیں، مُبہم نہیں، علامتیں فکر انگیز ہیں، ژولیدہ نہیں، کہیں بھی تصنّع یا کاوش کا نشان نہیں ملتا۔ کہیں بھی کوئی شعوری الجھن، کوئی بناوٹی خیال آرائی قاری کو نہیں کھٹکتی، کسی بات پر کسی بلند بانگ فلسفے کی چھاپ نہیں، ہر آواز ایک مدھم گھلاوٹ میں بدل کر شاعر کے دل کی ایک ایسی دنیا کا پتا دیتی ہے، جہاں کالے سرو پہاڑوں اور رنگین کومل پنکھڑیوں، نیلے موّاج سمندروں اور لرزاں، بے بس آنسوؤں کی حقیقتیں احساس کے ایک ہی نرم رو دھارے پر یکساں بہتی چلی گئی ہیں۔ ہر اظہار کے پیچھے ایک بے خود اور خود آشنا روح کی ایک ایسی نکھری ہوئی معصومیت جلوہ آرا ہے، جس میں لطیف جذبوں کی تازگی بھی ہے اور سوچتی دھڑکنوں کی آنچ بھی!

مجید امجد

دھرتی کی آواز

بادلو! دُھند کے مانند بکھرنا سیکھو
یہ بھی کیا اوجِ ثریّا پہ گرجتے رہنا
زخمی چیتے کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا
یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی عیادت کے لئے
اور اگر آنا تو اک برق سی بن کر آنا
کسی نادار کے خرمن کو جلانے کے لئے
کسی مفلس کی ٹھٹھرتی ہوئی کُٹیا کے قریب
اُس کے معصوم سے بچّے کو بھسم کر جانا

بادلو! دُھند کے مانند بکھرنا سیکھو
اِک ردا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر

اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچّوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جُرم، فریب
میرے بچّوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ، اُتر آؤ مری دُنیا پر![1]

[1] یہ نظم پہلی بار "ساقی" میں نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے چھپی تھی۔

نوجوانی

سارے عالم پر ہے سنّاٹا محیط
دم بخود ہیں پیڑ، چپ ہے کائنات
مسکراتی چاندنی کی گود میں
روتے روتے سو گئی معصوم رات

آسماں پر کہکشاں، کھوئی ہوئی
خاک پر خاموش لاکھوں مرغزار
رہگذر سے ہٹ کے اک برگد کا پیڑ
اپنی پرچھائیں سے گویا ہم کنار

پیڑ کے سائے میں دو خاموش بُت

دُو شگوفے، زیست کے سربستہ راز
دُو دھڑکتے دل، فنا سے بے خبر
آنے والی تیرگی سے بے نیاز

تخلیق

کیا جُرم تھا یہ میرا
جب رات نے دم توڑا
جب تاروں نے رو رو کر
آکاش سے مُنہ موڑا
جب چاند کے بجرے نے
مغرب کی چٹانوں میں
کرنوں کے سمندر کو
دم بھر کے لئے چھوڑا
جب صُبح نے مُسکا کر
چمکیلا گھر اپنا
قاصد کے لبادے میں

پھولوں کی طرف بھیجا
میں ساتھ چلا آیا
کیا جُرم تھا یہ میرا؟

دائرہ

حسیں ابر پارو!
تھرکتے ہوئے تم سدھارو
کسی سینہ تانے ہوئے کوہ کی چوٹیوں کو!

جواں کوہسارو!
ذرا کھول دو اپنا آغوشِ امشب
یہ کچھ ابر پارے، مصیبت کے مارے
جنھیں ریگِ صحرا نے ٹھکرا دیا ہے
بسر رات کرنے چلے آ رہے ہیں

حسیں مرغزارو!

ذرا صبر کرنا کہ کچھ ٹھٹھرے مہماں
کسی سنگ دل میزباں کی دُرشتی پہ آنسو بہاتے
تمہارے جواں سبز و شاداب کھیتوں پہ گوہر لٹاتے
اِدھر سے گزرتے ہوئے جا رہے ہیں!

شگفتہ گُلو!
دیکھنا دوسروں کی امانت ہیں گوہر
جنہیں تُم سمجھتے ہو اپنا تمہارے نہیں ہیں
یہ تابندہ موتی جنہیں تم رُلاتے ہوئے ہنس رہے ہو
ابھی پَل میں تم سے جُدا ہو رہے ہیں!

منوّر شعاعو!
مگر روشنی تیز تر کرتی جاؤ
یہ تابندہ موتی ہیں با دل کے ٹکڑے
یہ بچھڑے ہوئے ہیں کسی کارواں سے
انہیں کارواں تک ذرا لیتی جاؤ!

ندامت

تب ترے لب پہ تبسّم کی کرن لہرائی
سُرمگیں پلکیں اُٹھیں لرزشِ موہوم کے ساتھ
مدھ بھری آنکھوں کی نتھری ہوئی گہرائی سے
دو چمکتے ہوئے، ہنستے ہوئے، تارے اُبھرے
اِک نے مژگاں کے چمن زار کو سیراب کیا
دوسرا خار سے دامن کو چھڑا کر لپکا
خاک پر میری طرح گر کے رہا، گر کے رہا

اب جو مَیں وقت کی بے رحم سی اک موج کے ساتھ
کسی کاغذ کے کھلونے کی طرح بہتا ہوا
دم بدم تُند ہواؤں کے تھپیڑے سہتا

ایک پل کے لئے پتّھر کے جزیرے پہ رُکا
تو مجھے پھیلی ہوئی رات کی تاریکی میں
اُس ترے پہلے ستارے کی بہت یاد آئی

کاش مَیں تیری مسرّت کو جواں رکھ سکتا
کاش مَیں تیرے تبسّم کو سہارا دیتا
تاابد تیری نگاہوں میں لرزتا رہتا

یاد

خزاں نصیبوں کی انجمن میں
یہ مست جھونکا کہاں سے آیا؟

کہاں سے آیا، کسے خبر ہے
مگر یہی ہر زبان پر ہے:
ہوا کا اک بے قرار جھونکا
خزاں کی بے نُور انجمن سے
لگا تھا جب ناز سے گزرنے
تو سُوکھے پیڑوں نے سر اٹھا کر
نحیف بازو ہلا ہلا کر
خزاں کے اس شوخ میہماں پر

سنبھلتے، گرتے، ہزاروں پتّے
کئے بڑی دیر تک نچھاور!

گزر چکا ہے ہوا کا جھونکا
روش روش پر ہیں غم کے مارے
خزاں کے ٹوٹے ہوئے سہارے

سرِ راہ

شب کی محفل میں ہیں دو چار ستارے خاموش
اِن سے کچھ دُور، لئے پہلو میں قلبِ مہجور
اِک تھکا ہارا سا مہتاب، اکیلا تنہا
وہی مجھ ایسا مقدّر، وہی مجھ سا مجبُور

دلِ ناشاد! تجھے یاد نہ ہوگا شاید
ہم نے اک رات ستایا تھا حسیں تاروں کو
کوہ کے پار سے جب اُبھرا تھا برفاب سا چاند
ہم نے اِک گیت سنایا تھا سمن زاروں کو

اور اُس گیت کی اِک لرزشِ بے نام کے ساتھ

ناچ ناچ اُٹھے تھے کرنوں کے سُنہری دھارے
مُسکراتی ہوئی وادی کے تھرکتے جھرنے
نقرئی جھانجھنیں پہنے ہوئے نازک تارے

آج اس وادئ پُر نُور کی ہر شے ہے اُداس
مضمحل چاند، بجھے پیڑ، ستارے بے دم
آج تھک ہار کے بیٹھا ہے سرِ راہ کوئی
آسماں دُور، زمیں سخت، فضا نا محرم

یہ لوگ

اُونچے پیڑوں کے زرد رُو پتّے
اِتنے غم دیدہ اِتنے راندے ہوئے!
بات تک بھی مری نہیں سُنتے!

پاؤں کی چاپ سے لرزتے ہیں!
نرم آہٹ پہ کانپ اُٹھتے ہیں،
سہما جھونکا بھی گر گزر جائے!
لڑکھڑاتے ہیں، گرنے لگتے ہیں
جیسے بارانی رات کے موتی
جیسے آنسو کسی مسافر کے

پیڑ ذوقِ نمو میں کھوئے ہوئے
منتظر ہیں نئے شگوفوں کے
زرد پتّوں سے اِن کو پیار نہیں

زرد پتّوں کو کوئی سمجھائے
یہ مری بات ہی نہیں سُنتے!

ننھّے مزدور

شب گزری اور سورج نکلا، ہوگیا عالم بُقعۂ نُور
سوئے تارے، جاگے پنچھی، وہ قیدی تھے، یہ مزدور

باؤ چلی، لہرائے پتّے، اُڑ گئے پنچھی کوسوں دُور
پورب، پچھّم، اُتّر، دکن چاروں اور گئے مزدور

سُونے ہوگئے رین بسیرے، کھیت ہوئے سارے بھرپور
ہر دہقاں کے ہل کے پیچھے رقص کناں ننھّے مزدور

روزی دن کی آج ملے بس یہ ان کی فریاد
دہقاں کو ہے غم فردا کا، یہ اس سے آزاد

حیاتِ نو

نقرئی سِکّوں میں ڈھلتے ہوئے یہ شام و سحر
ایک بے نُور اُداسی کی گپھا میں چُپ چاپ
نرم بُوندوں کی طرح گرتے چلے جاتے تھے

ہر نئی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
اِک ستارہ اُبھر آتا تھا فلک پر چُپ چاپ
دو ستارے میری آنکھوں میں بھی لہراتے تھے

ہر شبِ تیرہ کے انجام پہ دونوں آنسو
میری آنکھوں کے جھروکوں سے نکل کر چُپ چاپ
میرے گالوں پہ لڑھکتے ہوئے کھو جاتے تھے

آج مَیں اِک نئی چہکار سے جاگ اُٹھا ہوں
قہقہہ ــــ ننّھی سی گڑیا کا، دَر آیا چُپ چاپ
اور میں خوابِ گرانبار سے جاگ اُٹھا ہوں

نئی پود

خزاں کے پنچھی برہنہ شاخوں پہ جھولتے ہیں!

بہار کب کی گزر چکی ہے
بہار کے خوش گلو مغنّی
دمکتی صبحوں کے گیت گاتے
اداس شاموں پہ مُسکراتے
لچکتی شاخوں، سمٹتے غنچوں، لجاتی کلیوں کو گُدگُداتے
نجانے کس سمت جا چکے ہیں!

چمن کے آتش نوا پرندے نجانے کس سمت جا چکے ہیں
خزاں کے آوارہ حال پنچھی شکستہ معبد کو پوجتے ہیں
برہنہ شاخوں پہ جھولتے ہیں!!

آوارہ

ہَوا کی منزل کہیں نہیں ہے!

ہَوا کی منزل کہیں نہیں ہے
کبھی سرِ کوہ اس کا مسکن،
کبھی سمندر کی ہم نشیں ہے
ہَوا کی منزل کہیں نہیں ہے

ہَوا — کبھی تُند و تیز طوفاں
ہوا — کبھی اِک نسیمِ خنداں
کہیں بُجھائے ہزاروں دیپک
کہیں منوّر کرے خیاباں

پہاڑ، صحرا، چمن بیاباں
کبھی کہیں ہے کبھی کہیں ہے
ہَوا کی منزل کہیں نہیں ہے

شبِ یلدا

عجیب شب تھی!
فلک کی زرد اور سُست رَونائی کا بھی کوئی نشاں نہیں تھا
سجیلے تاروں کی محفلیں بھی کہیں نہیں تھیں
دمکتے جگنو، لرزتی شمعیں —— کوئی نہیں تھا
عجیب شب تھی کہ نُور کے سارے سیم پارے
کنارہ کش ہو گئے تھے جیسے
ندی کنارے، ہم ایک میداں میں مُہر برلب
اُداس وحیران و دل گرفتہ، یہ سوچتے تھے
نجانے کب کوئی سیم پیکر
مہیب شب سے، لڑے گا آ کر ہماری خاطر!

عجیب شب تھی

طویل اتنی کہ آج بھی، ہم اسی کے زنداں میں دم بخود ہیں
سیاہ ایسی کہ اب بھی ہم کو کسی سہارے
کسی دمکتے ہوئے ستارے کی آرزو ہے!

قریب و دُور

یہ قُربت! یہ دُوری!
جو سوچو تو ہے دُور تاروں کا عالم
جو دیکھو تو شبنم کی صُورت سحر دم
کبھی گُل کی پتّی پہ کچھ سیم پارے
کبھی بُجھتی آنکھوں میں کچھ اشکِ پیہم

یہ قُربت! یہ دُوری!
جو پلکیں اٹھاؤ تو اِک قُربِ باہم
جو پلکیں گراؤ تو اِک ہُو کا عالم
وہی آرزؤں کے بُجھتے شرارے
وہی دل — وہی دل کا صحرائے اعظم

آخرِ شب

شبِ زمستاں کا سرد دامن
وہ سرد دامن کہ نرم کہرے میں ڈھل گیا ہے
ہر ایک شے کو نگل گیا ہے

ڈھلک گئی ہیں خموش پیڑوں کی گیلی باہیں
بکھر گئے ہیں زمیں کی تُربت پہ زرد پتّے
ٹپک رہے ہیں لرزتے آنسو شبِ زمستاں کی چشمِ تر سے!!

کوئی نہیں ہے!
یہ جسم بھی اَب تو اجنبی ہے

کمر شکستہ، نحیف و بے بس، اُداس راہوں پہ چل رہا ہے
سفید کُہرے میں ڈھل رہا ہے!!

مَن و تُو

چار سُو اِک بحرِ ناپیدا کنار
سینۂ لرزاں پہ جس کے بے قرار
موجۂ طوفاں، ہوائے شعلہ بار
ناتراشیدہ اُمنگوں کی جلن
سینۂ سوزاں میں پیہم اِک لگن
ہو بہو میری طرح!

اِک جزیرہ، خامشی سے ہم کنار
زرد کلیوں، سُرخ پھولوں کا دیار
نودمیدہ آرزوؤں کی بہار
صد حجاباتِ حسیں کی انجمن

بحر کی آشفتگی پر خندہ زن
ہو بہو تیری طرح !

بازگشت

کھڑی رہو!
گزر رہا ہے کارواں
بساطِ آسماں پہ ہیں حسیں تھرکتی بدلیاں
کوئی یہاں، کوئی وہاں
وہ — دُور، نیچے رہگذر پہ رینگتے ہوئے جواں
کہ جیسے مورِ ناتواں کا قافلہ رواں دواں!

کھڑی رہو!
کھڑی رہو کہ کُھل گئی ہیں بند تھیں جو کھڑکیاں
روش روش سے آ رہی ہے اب ہولئے گلستاں
مہک اُٹھا ہے ناگہاں

دلِ غریب و خونچکاں
مگر سُنو! یہ چاپ کس کی آ رہی ہے بے گماں؟

کھڑی رہو!
ڈرو نہیں، وہ چاپ کھو گئی کہیں
نہیں! — وہ نیچے رہگذر پہ دیکھ لو کوئی نہیں
فلک پہ زرد بدلیوں کا بھی کوئی نشاں نہیں
وہی ہے صاف آسماں، وہی ہے سنگ دل زمیں
کھڑی رہو — ڈرو نہیں!!

انجام

پھول تھا — مُرجھا گیا!
بھیگی بھیگی چاندنی میں، بارشِ انوار میں
دیر تک گرتی رہیں آبِ رواں پر پتیاں
دیر تک قائم رہا مرگِ مسلسل کا سماں
جانے کیا ہوتا رہا!

اوس کی پریاں نسیمِ مشک بُو کے دوش پر
پھر رہی ہیں دل گرفتہ، سرگراں، نوحہ کناں
اب کہاں ان کو ملے گا حشر تک اس کا نشاں
خواب تھا — آیا، گیا!

پھول تھا — مُرجھا گیا!
رات کے دُکھتے بدن کو گیت سے سہلا گیا
پھول تھا — مُرجھا گیا!

مَیں اور تُو

اک البیلی پگڈنڈی سے
اُفتاں خیزاں، گرتی پڑتی، ندی کنارے اُتری ہے!

ندی کنارے، باہیں کھولے، اک البیلا پیڑ کھڑا ہے
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیران کھڑی ہے
جسم چُرائے، آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے!

جانے کب سے باہیں کھولے، رستہ روکے، پیڑ کھڑا ہے!
جانے کب سے
جسم چُرائے، آنکھ جُھکائے، پگڈنڈی حیران کھڑی ہے!!

اکیلا

آسماں، میدان جس میں ہو نہ گھاس
چاند جیسے کوئی چرواہا، اُداس
پھیکا پھیکا سا تبسّم، شب کے پاس

اِک صدا اور اِک صدائے بازگشت
ایک مَیں — اِک چاند کا بے رنگ طشت
منزلوں تک میرا ہم دم، ایک دشت

دشت ہے اور دشت کا سیلِ رواں
سنگ ریزوں کی بکھرتی داستاں
ہر طرف — ارض و سما کے درمیاں

فن کار سے!

کیوں تُم ہر ویران گلی میں پھرا کئے نادان
کیوں تُم ہر دہلیز سے لگ کر کھڑے رہے حیران

تُم جو پھرے ان سُونی گلیوں میں دن رین
کہو کسی نے ڈالا بھی دل کے کشکول میں دان

تُم تنہا تھے، تُم تنہا ہو یہاں تمہارا کون
کون ایسا ہے اس جگ میں تُم کرو گے جس پر مان

شہر کے باہر اَلھڑ جھونکے، خُوشبوئیں اور رنگ
شہر کے اندر گھُپ اندھیارا اور جلتے شمشان

جل جاؤ تُم آگ میں لیکن بُجھے نہ من کی آگ
اس قندیل سے ملتا جائے سب کو نُور کا دان

تعاقب

تری یاد
ایک زخم خوردہ سے آہو کے مانند تھک ہار کر گر پڑی ہے
کسی کانپتے، لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کی چاپ جیسے
بہت ہولے ہولے
کسی سرد پتھر پہ جا کر رُکے، پھر نہ اُبھرے
وہ پتھر جو اِک گہرے پُرہول کھڈ کے دہانے پہ گردن جھکائے
ازل سے کھڑا ہو!

نہ جانے مَیں اس کالے بے جان پتھر پہ کب سے کھڑا ہوں
مرے سامنے اِک بھیانک خلا ہے
خلا ــــ جو تری یاد کو کھا گیا ہے!!!

زندگی

کبھی سرد جھونکے کو صحنِ چمن سے
بھٹکتے ہوئے، لڑکھڑا کر گزرتے ہوئے تُم نے دیکھا؟
وہ اِک سرد جھونکا کہ جس کے دَر آتے ہی
رستوں پہ بکھرے ہوئے زرد پتّے
تھرکنے، مچلنے، تڑپنے لگے ہوں!

یہ رستوں پہ بکھرے ہوئے زرد پتّے
یہ پامال لاشے
درختوں کے، پھولوں کے، یادوں کے لاشے
کبھی زرد پتّوں کو، پامال لاشوں کو، از خود تھرکتے ہوئے تم نے دیکھا؟

اگر بات یہ ہے
تو پھر سرد جھونکے کے چلنے، تھرکنے
چمن سے گزرنے کو تم کیا کہو گے؟

یہ اک سرد جھونکا جسے تم نے آوارہ پنچھی کہا ہے
یہی زندگی ہے
اسی سرد جھونکے سے دنیا بنی ہے!

پُرانی بات

کسی مضمحل شام کے جھٹپٹے میں
بہت دُور جاتا ہوا کوئی پنچھی
کسی درم بجود پیڑ کو اپنا مسکن بنائے
تو اُس پیڑ کی نرم، لچکیلی شاخیں
بگڑ کر، بُرا مان کر، کسمسائیں
گھنے سرد پتّوں میں دبکے ہوئے شب کے باسی
بڑے زور سے چیخ کر پھڑپھڑائیں
سنبھلنے لگیں اور سنبھلنے نہ پائیں
اگر کوئی پنچھی کسی شام کے جھٹپٹے میں ——

مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں

میں پنچھی نہیں ہوں کہ اِک پل کے سُکھ کے لئے
تیری پھولوں بھری نرم آغوش کو اپنا مسکن بناؤں
زمانے کو
تیری بھری بزم کے کسمسانے
بڑے زور سے چیخ کر پھڑپھڑانے کا منظر دکھاؤں
مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں!

جنگل

کبڑے پیڑوں کے جنگل میں
پتوں کی کالی دیواریں
دیواروں میں لاکھوں روزن
روزن، آنکھیں ہیں جنگل کی
وحشی آنکھیں ہیں جنگل کی

تو راہی، انجان مسافر
جنگل کا آغاز نہ آخر
سب رستے ناپید ہیں اس کے
سب راہیں مسدود سراسر
تو راہی — جگنو سا پیکر

ہار چکا جنگل سے لڑ کر!
اب آنسو کا دِیا جلائیے
تُو — گُم کردہ راہ مُسافر
ایسی پاگل نظروں سے کیوں
اَوجِ فلک کی پیشانی پر
جھلمِل کرتے اُس جُھومر کو
گُھور رہا ہے ؟

انسان

اوس کی طرح شبک، پھول کے مانند حسیں!
اُڑتے بادل کی طرح صبح کہیں، شام کہیں
ایک نغمہ جسے اب تک کوئی سمجھا ہی نہیں

منتظر، صبحِ پُرانوار کا، ہنگامِ سحر!
نکلے خورشید اسے خاک بھی آئے نہ نظر
علم کی آخری حد، جہل کا تاریک نگر

شام مہکے تو ملائم سے اندھیرے چھائیں
چھلکے پازیب، تھرکتے ہوئے تارے گائیں
دل کی مردنگ بجے، نیر برستے جائیں

مسرّت!

درختوں کے نیچے
کوئی ـــــ زرد پتّوں، جلی کونپلوں
اَدھ کِھلی خشک کلیوں کی چادر بچھائے
ترا منتظر ہے!

بتا کون ہے یہ؟
جو اِن گنگ ہونٹوں، بُجھی بے صدا آنکھوں
جلے سرد ہاتھوں کے ہوتے ہوئے بھی
ترا منتظر ہے!

بتا کون ہے تُو؟

کہ اِن زرد پتّوں، جلی کونپلوں
ادھ کِھلی خشک کلیوں کی چادر پہ اکثر
ترے نرم قدموں کی موہوم آہٹ
اُبھرتی ہے — پھر ڈوبتی ہے اُبھر کر

بتا کون ہے تُو؟
کہ یہ دل ازل سے تجھے جانتا ہے
تُجھے تیری آہٹ سے پہچانتا ہے!!

پت جھڑ

پَت جھڑ کی رُت بھی کیسی ہے
ہر شے جیسے ہار چکی ہے
چُپ کی ڈور میں ایک اِک پنچھی
بندھا ہوا بے بس قیدی ہے
ننگی شاخیں مُہر بہ لب ہیں
گُبرِیلے پیڑ نے جاں دے دی ہے
پھٹی پھٹی نظریں ہیں ہر سُو
ہر جانب دیوار کھڑی ہے
کس کو ڈھونڈیں، کس کو پائیں
گہری، گھائل خاموشی ہے!

پت جھڑ کی بھی کیسی رُت ہے
چُپ ہے جیسے کوئی کھنڈر ہے
چونکاؤ تو ھر بِن مُو میں
ذوقِ نمو ہے رقصِ شرر ہے
ذرّہ ذرّہ ایک نگر ہے!!

پیپل

اِک پیپل کے نیچے مَیں نے اپنی کھاٹ بچھائی
لیٹ گیا مَیں کھاٹ پہ لیکن نیند نہ مجھ کو آئی
آہیں بھرتے، کروٹیں لیتے، ساری عمر گنوائی

پیپل کے پتّوں کو گنتے، کرتے اِن پر غور
پیپل کی شاخوں کو تکتے بیت گیا اِک دَور
پیپل کی ہر چیز پُرانی، البیلا ہر طور

چلے ہوَا تو ڈالی ڈالی، لچک لچک بَل کھائے
رُکے ہوَا تو سادھو بن کر دھیان کا دیپ جلائے
جھکّڑ کے ہر وار پہ ڈولے، چیخ چیخ رہ جائے

پیپل کی شاخوں پر بیٹھے کچھ پنچھی سستائیں
باہر سے کچھ آنے والے اِک کہرام مچائیں
گائیں گیت انوکھے مل کر، ناچیں اور نچائیں

پیپل کیا ہے؟ — جوگی کا بے در سا اک استھان
جھونکے، پتے، پنچھی، انساں، سب اُس کے مہمان
کھاٹ پہ لیٹا سوچ رہا ہوں میں، مورکھ۔ نادان!

عکس

آسماں ہے اک ردائے نیلگوں
اِک ردائے نیلگوں اور ابر کے ٹکڑے ہزار،
ابر کے ٹکڑوں کے نیچے، اک اکیلا کوہسار
مُہر برلب ـــــ سوگوار!

کوہ کے قدموں میں اِک جوئے رواں
سبز مخمل کی حسیں مسند پہ بَل کھاتی ہوئی
کوئی ناگن رینگتی، پُھنکارتی، جاتی ہوئی
جاتی ہوئی ـــــ دیوانہ وار!

تُند خُو جوئے رواں کے پاس کھیتوں سے اِدھر

بھیگے پنچھی کی طرح سہما ہوا ننھا سا گھر
گھر کی چھت پر ایک پیکر، منتظر — وقتِ سحر
منتظر —— اور بے قرار

کوئی جھانکے اس حسیں پیکر کی آنکھوں میں اگر
نیلگوں پردوں پہ دیکھے ابر کے ٹکڑے رواں
عارضِ سیمیں پہ بہتی آنسوؤں کی ندیاں
ندیاں —— بے اختیار!

رات

رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں پھول ہزار
سچّے موتی، کچّی کلیاں اور کلیوں کے ہار
بھینی بھینی باس کی زد میں آیا سب سنسار

رات سجا کر لائی ہے اِک تھال میں دیپ ہزار
ہاتھ رنگیلے، ہونٹ دہکتے، گال کا رنگ انار
روشن ماتھے کی کرنوں نے چھیڑے دل کے تار

رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں نِیر ہزار
زخمی تارے، گھائل سپنے، شبنم کے اسرار
دُکھ کے زرد نکیلے کانٹے ہوئے جو دل کے پار

بات

دل کی بات بہکتے قدموں لب کی منڈیر پہ آئی
تاریکی میں رہی تھی برسوں، سورج سے گھبرائی
چُندھیائی آنکھوں کو مَل کر، لی اُس نے انگڑائی

لب کی منڈیر سے لگ کر اُس نے، سُنا انوکھا شور
اور پھر یک دم مُڑ کر اُس نے دیکھا اپنی اُور
ننگی گردن، ننگی باہیں، ننگی اِک اِک پور

لب کی منڈیر سے ہٹ گئی فوراً نظروں سے شرمائی
سارے عالم پر بے بس سی اک خاموشی چھائی
پھر نکلی تو بھاری گھونگھٹ جیسے دُلہن، آئی

جب اور اَب

دل —— لاکھوں آوازوں کا اِک گہوارہ تھا
نئی نویلی، سجل، رسیلی آوازوں کا اک جُھرمٹ تھا
بھور سمے جب باؤ چلتی، ننّھے پنچھی مِل کر گاتے
آشاؤں کے پَٹ کُھل جاتے
پُھول سا دل لہراتا
دُھوم مچاتا
ایک چھریرا، بانکا نغمہ، دُنیا پر چھا جاتا!

اور اَب دُنیا!
لاکھوں آوازوں کا اِک گہوارہ ہے
جسم چِراتی چاپ بھی ہے اور دل دہلاتی گونج بھی ہے

اور چیخیں —— تیز، نکیلی چیخیں
گھائل چیتے کی سی چیخیں
وقت کے اُڑتے دامن میں اَب پنجے اپنے گاڑ رہی ہیں
ہر جانب اِک شور بپا ہے
آوازوں کی اس برکھا میں
دل کی اَب آواز کوئی سنتا ہی نہیں ہے
اِس اُجڑی نگری میں کوئی رُکتا ہی نہیں ہے

شام

شام نے پَر پھیلائے
کالے کلوٹے چمگادڑ، درزوں سے باہر آئے
شام نے پَر پھیلائے!

سُورج کا رَتھ پچھم کے کیلاش سے جا ٹکرایا
اِک شعلہ سا بھڑکا اور پھر چھایا ہی چھایا
لُٹتے لُٹتے لُٹ گئی آخر، دھرتی کی مایا

کلس، منڈیریں، گنبد، چھجّے، دیواریں، میدان
چھِن بھر کو پگھلے سونے میں سب کا تھا اشنان!
اُس کے بعد کہاں کی مایا اور کیسا نروان

شام نے پَر پھیلائے
پھیکے، باسی ہار دُکھوں کے، رستوں پر بکھرائے
شام نے پَر پھیلائے!!

عشق

اِک پتھریلی چُپ نے سینہ تان لیا!
دل نے دستک دے کے کہا، پہچان لیا؟
یہی ہے تیری منزل، تونے جان لیا؟

منزل بھی یہ کیا منزل ہے، سانس نہ لو
بات کرو پَر بات کے ساتھ آواز نہ ہو
موتیوں ایسے نیر گریں، جھنکار نہ ہو

ہنستی چال! چھکتی چھاگل! ہوش کرو
دِل پاگل ہے، پاگل کی مت بات سُنو
اس گھیرے سنّاٹے میں خاموش رہو

طلسم

آدھی رات کا سنّاٹا ہے جیسے کوئی طلسم
سُونی راہیں، گم سُم گلیاں، پاؤں کی زد میں جسم

گونگے شہر کے اس مرقد میں ہر شے دبک گئی
اپنے ہی سائے سے ڈر کر، خود میں سمٹ گئی
سوئی منڈیریں چُپ دیواریں، دروازوں پر قفل
سنّاٹے کے سیلِ رواں میں ہر شے ڈوب گئی

دل کہتا ہے — کاش کہیں سے چیختا پنچھی آئے
چاند کا کنگن، کالے بھیانک پربت پر گر جائے

کنگن سے کرچیں اُڑ اُڑ کر بکھریں، دُور تک آئیں
جگمگ کرتے ننھے ننھے تارے بنتی جائیں

بُلاوا

ریشم سی کومل پتّی سے آنسو پونچھے اوس
پَو پھٹتے ہی دل ڈوبے جب اُبھریں کالے کوس

راہ کٹھن ہے اور رستے کے کانٹے ہیں غم خوار
پگ پگ دامن کھینچ کے پوچھیں، کہاں چلے ہو یار
پتّھر ٹھوکر کھا کر بولیں، اِک پل یہاں گزار
جنگل ہنسی اڑائیں اتنی، چلنا ہو دشوار

راہ کٹھن ہے اور منزل سے آتے ہیں پیغام
تیرا رستہ تکتے تکتے ہم نے صبح سے کی ہے شام

پیار

پیار کے کچّے دھاگے میں اب کون پروئے دل
آیا جھونکا، ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل
بچھڑ گئے سب سنگی ساتھی، ڈوب گئی منزل

کون کسی کا دامن تھامے، کون کسی کا مِیت
شبنم ایسے کچّے رشتے، بادل ایسی پریت
پل بھر برسیں نین رسیلے، پل بھر کا سنگیت

شام چِتا میں سورج کی، کیوں اپنا انگ جلائے
رات بچاری کس کی خاطر تارے گنتی جائے
پیار کے رشتے کچّے دھاگے، پیار سے ہم بھر پائے

دُکھ کی ڈور سے بندھا ہوا ہے یہ سارا سنسار
روتی شبنم، روتا بادل، نینوں کی پھوہار
دُکھ جیون کا ساتھی سنگی، دُکھ سے ہم کو پیار

فرازِ کوہ

دیکھا فرازِ کوہ سے میدان کی طرف
شطرنج سی بچھی ہوئی آئی ہمیں نظر
کھیتوں میں دھوپ چھاؤں کا پھیلا چار سُو
خاکِ وطن بٹی ہوئی ٹکڑوں میں سر بسر
قبروں کے ڈھیر، ملبے کے انبار جا بجا
نیزوں کی طرح اکڑے ہوئے آہنی شجر
مغرب سے آفتابی شعاعوں کی برچھیاں
مشرق میں سہما سہما ہوا مضمحل قمر!
ہر سمت، اک کشاکشِ پیہم میں مبتلا!
جنگل کے پیڑ، شہر کے باسی، اُداس گھر!

جب تک فرازِ کوہ سے دیکھا نہ تھا ادھر
برہم تھے ہم، نہ تھی ہمیں اس بات کی خبر
شطرنج کی بساط بچھی ہے زمین پر

بے وفا

دِل اِک سُوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
اپنوں سے مُنہ موڑ کے جس نے تجھ سے رشتہ جوڑا

سُوکھا پتّا، شاخ سے ٹُوٹا اب تُو اسے اُڑائے گی
جہاں بھی تیرا جی چاہا تُو ساتھ اسے لے جائے گی
روش روش پر، گلی گلی میں، کیا کیا ناچ نچائے گی
دیواروں سے دے مارے گی، پاؤں سے ٹھکرائے گی
پنکھ اس کے جب جھڑ جائیں گے تُو آگے بڑھ جائے گی

دل اِک سُوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
چھوڑ اپنوں کو اس پاگل نے کس سے رشتہ جوڑا

ملاقات

پَوَن چلی
اور شب کی کنواری گھاس کے آنسو بکھر گئے
نرم، ملائم آنچل پر شبنم کے موتی لرز گئے
سبز گپھائیں، گُم سُم بیٹھے
پُھول ایسے نازک پنچھی کے
پنکھ سنہری، ڈول گئے!

پَوَن چلی
کچھ ہولے ہولے، خود سے لجاتی
ہر کھٹکے پر رُک سی جاتی

ننگے پاؤں، شب کی کنواری — گھاس پہ چلتی
پیڑ کے نیچے آن رُکی

پیڑ کے نیچے
تنہائی کی گھور گپھا میں تُم بیٹھے تھے
تھکی تھکی پلکوں سے تمہاری
اوس کے موتی چھنٹے تھے
یوں رُکی — سب بکھر گئے!!

سفر

تھکا ماندہ بے جان بادل کا ٹکڑا
درختوں، چٹانوں سے دامن بچاتا
پہاڑی کے کوہان سے نیچے اُترا

بہت تھک چکا تھا
ہزاروں برس کی مسافت
ہزاروں برس تک بس اِک دُھن مُسلّط
بڑھے، آگے بڑھ کر
پہاڑوں، درختوں، نکیلی چٹانوں
ہوا کی نہتّی، سِسکتی ہوئی
کرب میں ڈوبی چیخوں کو

مٹھی میں لے کر، مسل کر
بڑی سادگی سے ہنسے، مسکراتے!

وہ دُھن اب کہاں ہے؟
وہ ننھی سی، معصوم سی مسکراہٹ
خمیدہ لبوں سے پھسل کر
حسیں اوس کے شوخ قطرے کے مانند
اب خاک پر گر چکی ہے
تھکا ماندہ، بے جان بادل کا ٹکڑا
درختوں، چٹانوں سے دامن بچاتا
پہاڑی کے کوہان سے دم بہ دم
گھرے پُر ہول کھڈ میں اگر جا رہا ہے
تو کیا ہے؟!

یہ بادل کا ٹکڑا بہت تھک چکا ہے
بہت تھک چکا ہے!!

اجنبی

اُودن اُتری بھیڑ کے مانند پیڑ
مُنہ چڑاتی، دل دُکھاتی، چوٹیاں!
دُور نیچے پتّھروں کی سیج پر
سر پٹختی چیختی، ندّی رواں

آسماں پر مُردہ بادل خیمہ زن
قہقہوں سے رعد کے ناآشنا
مہر جیسے کوئی مجبُورِ ازل
ایک میلے جال میں اُلجھا ہوا

ملگجی سی روشنی میں ایک پیڑ

کانپتی اُنگلی سے مجھ پر خندہ زن
آسماں پر دائرے کے رُوپ میں
چیختے، روتے ہوئے بُھوکے پرند
دم بہ دم غوطہ لگاتے میری اور
دم بہ دم مجھ پر جھپٹتے مُردہ خور

واپسی

دوپہر کجلا گئی!
کھوئی کھوئی سی فضا میں ایک پیڑ
پیڑ کے نیچے ملائم سبز گھاس!
گھاس پر ہم، نیم وا آنکھوں کے ساتھ
دیر تک سنتے رہے بھونروں کے گیت
دیر تک سونگھا کئے پھولوں کی باس!
پیڑ پر پتّوں کے لاتعداد گھر
اور گھروں میں جابجا نورانی دَر
ایک اک دَر سے اُتر کر روشنی
سیم گوں پوروں سے ہم کو چھیڑتی
اور ہم —— بے ساختہ کروٹ بدل

چھاؤں کے ٹھنڈے جزیرے کی طرف
قہقہوں کی ناؤ میں، جاتے نکل!

ناگہاں وہ دوپہر کجلا گئی
چیختے، پھنکارتے جھونکے بڑھے
دل گرفتہ پیڑ کے پتّے گرے
روشنی کے بجھ گئے سارے دیے
قہقہوں کا شور، گُل کی گرم باس
ناچتے ہنستے ہوئے بھونروں کا راگ
خاک پر لیٹی ہوئی مجبوب گھاس
گرد کے کہرام میں سب کھو گئے
راستے دُو — پھوٹ کر گُم ہو گئے

دوپہر کجلا گئی!
ایک اندھی نیم جاں، کُبڑی سی شام
شوخ یادیں، بیتے لمحے، پوٹلی میں باندھ کر

لڑکھڑاتی، ہانپتی — آگے بڑھی
پیڑ کے تن سے لپٹ کر رو پڑی!

نیا سال

سیمگوں کلیوں کی ٹھنڈی سیج پر لیٹی ہوئی
صُبح — اک سیّال سونے کا طلسم
صُبح — جیسے تیرا جسم!

بادلوں کی گرم، بوجھل شال میں لپٹی ہوئی
شام — گہری برف کی بے جان سِل
شام — جیسے میرا دل!

شام، بجھتی شام تیرے سامنے
صُبح، ہنستی صُبح میرے رُو برُو!!

نارسائی

آنکھ مچولی کھیلتے تاروں کی سُن کر چہکار
کچی نیند سے رات کی رانی جاگ اُٹھی یکبار
تاروں نے دم سادھ لیا بُت بن گئے سب اشجار

گجرے پہنے، بال سنوارے، چپل دئے اُتار
سُندر آنچل سر پہ لے کر ہو گئی وہ تیّار
ننگے پاؤں، جھینپتی ڈرتی، چلی پیا کے دوار

اِک پتّھر پہ اکڑوں بیٹھا سوچ رہا ہوں یار
رات بچاری ہر شب یونہی ہوتی ہے تیار
آخر میں اِک بھیگا آنچل اور اشکوں کے ہار

سرپھرا

جلے خشک پتّوں
کڑی دھوپ میں گھاس کے سوکھے تنکوں،
اُدھڑتی ہوئی کول کی گرم سڑکوں کے بکھرے ہوئے
سنگ ریزوں میں، روئید گی ڈھونڈتے ہو
عجب آدمی ہو!

دُکھی شام کے ہانپتے، کانپتے جُھٹپٹے میں
کسی کالے انجن کی دلدوز چیخوں کو سُن کر
سیہ آہنی ریل کے پُل پہ جُھک کر
بڑے غور سے ہر گزرتے مسافر کو تم گھورتے ہو
عجب آدمی ہو!

بجھی رات کی بے صدا خامشی میں
کوئی — چاند کی زرد قندیل لے کر
شکستہ مکانوں، تھکے راستوں،
ٹوٹی پھوٹی ہوئی خندقوں میں
کسی بیتے لمحے کو جب ڈھونڈتا ہے
تمہیں دیکھتا ہے
تو تُم — دفعتاً
اپنی چُندھیائی آنکھوں پہ ہاتھ اپنے رکھ کر
بگڑ کر
بڑے زور سے، کرب سے، چیختے ہو
عجب آدمی ہو!!

جسم

میں نرم خوشبو کا ایک پیکر
ہوا کے جھونکے کا ہم سفر تھا!
قدم قدم پر
گلوں کی تیز اور نشیلی خوشبو
کسیلی جھیلوں کی گرم گہری سی باس جس میں نمی گھلی تھی
گھنیرے جنگل کا لمس جیسے دُلہن کوئی عطر میں بسی تھی
سِسکتے، روتے مہیب شہروں کی بُو کہ جس سے
پُرانے "مندر" میں روشنی تھی،
وہ تیز خوشبو، وہ تیز بدبُو،
قدم قدم پر

ہوا کے جھونکے کی ٹھوکروں سے اُچک کے کیوں مجھ کو دیکھتی تھی
مرے سراپا میں ایسے گھل مِل رہی تھی جیسے
ازل سے ہم راز وہ مری تھی!

میں نرم خُوشبو کا ایک پیکر
ہوا کے جھونکے کا ہم سفر تھا
اور اب میں بوجھل سی گرم خوشبُو میں،
گرم بدبُو میں ڈھل چکا ہوں
میں آج اک جسم بن چُکا ہوں!!

دُکھ

تب ہاتھ کی گرفت سے ہر شے نکل گئی !
کھمبا ، منڈیر ، شاخ ، لرزتا ہوا شجر
اور آسماں پہ نقرئی بادل کا ایک پَر
مُٹھّی نحیف غنچے کے مانند کُھل گئی
اور ہاتھ کی گرفت سے ہر شے نکل گئی
کُندن سی باہیں شام کی یکبارگی اُٹھیں
اک چیخ تھی کہ کالے پہاڑوں تلک گئی
اور شام جیسے رات کے ساگر میں گُھل گئی !

تب رات خوشبوؤں میں نہائی ہوئی اُٹھی

نغمے کی گُونج سانس کے سرگم میں مل گئی

گردوں سے چند اوس کی بُوندیں ٹپک پڑیں

تاروں کی ہانپتی ہوئی بارات ڈھل گئی

بوڑھی گلی میں دھیرے سے چُپ خیمہ زن ہوئی

کھڑکی کی آنکھ کیا بُجھی، دُنیا بدل گئی

دکھ اوٹ سے کواڑ کے میری طرف بڑھا

بھیگی ہوئی نظر سے مجھے گھُورنے لگا

چمکتا لمحہ

چمکتے ہوئے تُند لمحے کی زد سے تُو کب بچ سکے گا!
یہ چمکیلا لمحہ کہ تیرے عقب میں ازل سے رواں ہے
تجھے روند کر یوں بڑھے گا کہ جیسے
پرِ کاہ سے مختلف تُو نہیں ہے!

لچکتے ہوئے سرد زینے پہ پاؤں رکھے
تُو — کسی ایسی منزل کی جانب رواں ہے
جہاں اس لپکتے ہوئے تُند لمحے کی زد سے اماں ہے
مگر ایسی منزل کہاں ہے؟

یہ لمحہ کہ خود ان گنت ساعتوں سے مرتب ہوا ہے

یہ لمحہ کہ صورت بدل کر شب و روز میں ڈھل گیا ہے
شب و روز ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے
مہ و سال کی ایک لمبی سی مالا بنے ہیں
وہ مالا تری نرم گردن میں اک طوق سا بن کے اب جھولتی ہے
یہ لمحہ — یہ سیمابی چمکیلا منکا
لپک کر تری لمبی مالا کے حلقے میں آتا ہے جس دم
تو مالا کا بڑھتا ہوا بوجھ، گردن کو تیری
زمیں بوس ہونے پہ مجبور کرتا ہے — اور تُو
بڑی بے بسی سے
تعاقب میں آتی ہوئی موت کو دیکھتا ہے۔
لچکتا ہوا سرد زینہ معاً بولتا ہے
ترا ہاتھ لکڑی کی بانہوں سے یک دم پھسل کر
ترے لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو تولتا ہے
مگر کون جانے تجھے کیا ہوا ہے
تُو اک بھیگی گٹھڑی بنا کر سرِ زینے کے قدموں میں دم توڑتا ہے

لپکتا ہوا تُند لمحہ تجھے روند کر ایسے بڑھتا ہے جیسے
پرِ کاہ سے مختلف تو نہیں ہے ! !

بلیک آؤٹ

زنگ آلود سائرن بولیں
تیز، بوجھل، مہیب آوازیں
ایک زخمی سی چیخ بن کے بہیں
چیخ کی لرزشوں سے ڈر ڈر کر
قمقمے مسکراتی آنکھوں کے
تیرگی کے سمندروں میں بجھیں
کھڑکیاں اپنی پلکیں جھپکائیں
چوک سے سیٹیاں انھیں ڈانٹیں
سرد، سنسان، دم بخود سڑکیں
چاپ کا انتظار کرتی رہیں
تیرگی، خامشی —— بہم ہو کر

شہر کی تنگ ٹیڑھی گلیوں میں
بے خطر، بے دھڑک، چلی آئیں
گُل شدہ آنگنوں کو پار کریں
ٹمٹاتے دلوں پہ وار کریں
اور کواڑوں سے اپنا سر پھوڑیں!

چیل

کمرے کی اکلوتی آنکھ سے باہر جھانکو
کول کی بھیگی سڑکیں دیکھو
گرد میں لپٹی، چوزوں کی بے کل آوازیں
اپنے لرزتے، کانپتے ہونٹوں کی آواز ملاؤ
دیکھو بستی جاگ اُٹھی ہے
شیشم کی چوٹی پر بیٹھی
چیل — مڑی ہوئی چونچ سے اپنی
اُلجھے پنکھ سنوار رہی ہے
اُوپر، پھیکے صاف فلک پر
چمنی کا بل کھاتا دھواں اِک دھبّہ بن کر
جُھک سا گیا ہے

دہکتے کیکر کے پنجوں سے نکل کر
چیختے مہکتے طوطوں کی اک ڈار کہ یک دم سہم گئی ہے
جامن کے اِک جھنڈ پہ گر کر ختم ہوئی ہے

تم بھی جاگو
تم کن میٹھے سُندر سپنوں میں غلطاں ہو
آنسو کی باریک ردا سے جھانک کے دیکھو
بستی پنکھ سنوار رہی ہے!

گوری اور کالی

پرندے ابھی چہچہائے نہیں تھے
کہیں کھیت کی مینڈھ سے کوئی سایہ
لپک کر گھنی جھاڑیوں میں چُھپا بھی نہیں تھا
ابھی آسماں، تھال میں زرد کلیاں سجائے
ہوا کے سُبکبار جھونکے سے اُلجھا نہیں تھا
سیہ چادرِ شب کے کونوں پہ بھاری سے پتّھر رکھے
خامشی جاگتی تھی!
لرزتی ہوئی اوس کی بُوند
جانے کہاں سے ٹپک کر
دمکتا ہوا ایک موٹا سا آنسو بنی
رات کی آنکھ میں تیرتی تھی

عجب روشنی تھی!

اور اب مسکراتی سحر اپنے چمکیلے ریشم کے گچھوں سے
سہمی ہوئی رات کی مشکیں باندھے کھڑی ہے
اُجالے کے اندھے نگر میں
لرزتے ہوئے سُرخ ہونٹوں سے رِستا لہُو پونچھ کر
ہنس رہی ہے
عجب تیرگی ہے!!

اُجڑتا شہر

سیہ رُو قلندر
عجب بے نیازی سے لوہے کا لمبا سا چمٹا بجائے!

کبھی کوئی تانگے کا گھوڑا، دہکتے ہوئے تیز چابک سے ڈر کر
کسی گرم، چکنی سڑک پر ذرا لڑکھڑائے
تو اک نقرئی قہقہہ، چیخ میں ڈوب جائے!

کبھی چہچہاتے ہوئے ننھّے بچّوں کی ٹولی
پُرانی سی اک بس کے پنجرے سے نکلے
گلی کے کُھلے مُنہ میں مُپکے سے اُترے
اُدھڑتی ہوئی اک عمارت کے اندر پہنچ کر معاً ٹوٹ جائے!

کبھی کوئی ریلا لڑھکتے ہوئے سائیکلوں کا
کسی کالے دھبّے سی منزل کو بڑھتا ہی جائے
کبھی تیز رفتار موٹر کے یک دم ٹھہرنے
بریکوں کی اک کرب انگیز سی چیخ کے لاکھوں ٹکڑوں میں بٹنے کی
آواز آئے
کبھی چوک کی ایک صدیوں پُرانی، نم آلود کھڑکی کی چوکھٹ پہ
ٹھوڑی ٹکائے

کوئی زرد چہرہ — پھٹی سُرخ آنکھوں کے زندان میں
بے قراری سے پھرتی ہوئی پتلیوں کا تماشہ دکھائے
تماشہ مگر کون دیکھے ؟
کبھی تُم جو دیکھو تو اِن پُتلیوں کے سمندر میں
اِس ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے آئینے میں
تمہیں اپنی بکھری ہوئی ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا اک ہیولے
اُبھر کر بُلائے

اُجڑتے ہوئے شہر کا ایک منظر دکھائے!!

تہذیب

چمکتے ہوئے قمقمے بُجھ گئے دفعتاً
چاند غوطہ لگا کر
گھنے تُند بادل کے سینے میں اُترا
نم آلود غاروں، سیہ گھاٹیوں سے پُراسرار سائے
ہزاروں برس کی تجلّی سے چندھیائی آنکھوں کو مَلتے
سیہ موٹے ہونٹوں پہ کالی سی اِک مُسکراہٹ سجائے
خُنک، تیز جھونکوں کے مانند
لہرا کے اُٹّھے
چٹانوں سے کُودے
درختوں سے، کھمبوں سے اُترے
جُھکی ٹین کی چھت سے پھسلے

بجھی رہگذر پر ہر اک سمت ناچے
بھیانک سا اِک قہقہہ بن کے چیخے
سیہ ناخنوں، لمبے دانتوں، مُڑے تیز پنجوں سے ہر شے پہ جھپٹے
کبھی اِس سے لپٹے، کبھی اُس سے لپٹے
بڑی دیر تک تند بادل کی صورت گرجتے پھرے!

بُجھے قمقمے جل اُٹھے دفعتاً
رہگذر پر کوئی ایک سایہ بھی باقی نہیں تھا
وہاں تھے —— خُنک چاندنی کی رداؤں میں لپٹے
حسیں، نرم، نوخیز باتوں میں کھوئے
ہزاروں ہی پیکر
بڑے خوبصورت!
بڑے خوب سیرت!!

عفریت

یہاں — خشک ندیوں کی سوکھی زبانیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹی ہوئی ہیں
برہنہ درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتّے
اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر
عجب بے بسی سے
خنک ریت کی میلی چادر پہ اوندھے پڑے ہیں!

مری ڈوبتی سانس کہتی ہے مجھ سے
کہاں ہے ترے تن کی اندھی گپھا جس سے تو آشنا تھا؟
کہاں ہے تری ذات کا وہ اندھیرا

جسے تُو نے اندھی گپھا میں مقیّد کیا تھا؟
جسے بے نشاں سی "مسافت" کا طعنہ دیا تھا!
وہ گم سُم اندھیرا
دھوئیں کا وہ بے نام دھبّہ
کسی بند جادو کی بوتل سے باہر نکل کر
تُجھی بانجھ دھرتی کی صورت
تری کور آنکھوں کے آگے اگر آج پھیلا ہوا ہے
تو یہ تیری اپنی خطا ہے!

عجب ماجرا ہے
اندھیرے کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہیں
تُجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہوں!!

اعراف

کہیں دُور ہنستی ہوئی برف کی پتّیاں
سُرخ بادل کے چھتنار سے ٹُوٹ کر
سبز کھیتوں، منقّش چھتوں، جگمگاتی ہوئی شاہراہوں کو
اِک پَل میں ڈھانپیں،
ملائم، مہکتے ہوئے جسم پر اپنی رنگت نچھاور کریں
خون تک کو ٹھٹھرنے پہ اُکساتی جائیں!

کہیں دُور ــــ دھرتی کی پِچکی ہوئی جِلد سے
کالے گنجان جنگل نکل کر
ہر اک چیز کو اپنے سایوں سے ڈھانپیں
بپھرتی ہوئی ندّیوں، وحشی آنکھوں، دھوئیں کے سندیسوں کو

کالی ردا میں چھپائیں
بڑی دُور تک اپنی پرچھائیوں سے
انوکھا سا اک خوف پھیلاتے جائیں
گھنے گہرے پتّوں میں دبکے ہوئے جسم پر کالی رنگت نچھاور کریں
خون کے کھولنے کا تماشا دکھائیں

مری سمت دیکھو، جہاں میں کھڑا ہوں
نہ بادل کا چھتنار مجھ پر کبھی خُوب رُوپتّیاں پھینکتا ہے
نہ جنگل کی کالی ردا ہی مجھے ڈھانپتی ہے
مرے چاروں جانب
ہر اک چیز مٹیالی رنگت میں کھوئی ہوئی ہے
لہو منجمد ہے
فضا پر تُھکی گرد کا سائباں ہے
زمیں ایک پھیلا ہوا خاکداں ہے!

مشورہ

کبھی اونچے پیڑوں کے جنگل میں
پتّوں کی موٹی سی تہہ پر قدم رکھ کے دیکھو
کبھی بوکھلائی ہوئی ندّیوں کے کناروں پہ
اُن مُتّند آنکھوں کو گھُورو
جو شاید ازل سے تمہیں گھُورتی آرہی ہیں!
کبھی جھاڑیوں سے
کسی اژدہا کے کھُلے مُنہ میں جاتے ہرن کی
وہ دلدوز چیخیں سنو جو ابد بن چکی ہیں!
ذرا اپنے تن پر سیہ خوف کی سرد انگلی کو پھرنے تو دو
تُم —— ذرا لمحہ بھر کے لئے رال میں لتھڑے ہونٹوں پہ
اِک چیخ بن کر رُکو —— رُک کے دیکھو!

ہَوا —— خشک پتّوں، پھلوں، بُوٹیوں
مُردہ پھولوں کی بُو سے کچھ اس درجہ بوجھل ہے، چلتے ہوئے ہانپتی ہے
کبھی اس کی کڑوی کسیلی تمازت سے نتھنوں کو تم آشنا تو کرو
کبھی اس بھیانک سیہ موت کا سامنا تو کرو
کبھی اونچے پیڑوں سے
پتّوں کے اِس فرش پر تم گرو —— گر کے دیکھو
کبھی میری دم توڑتی چیخ میں
اپنی تازہ، غم آلود چیخیں ملاؤ
کبھی اونچے سنسان پیڑوں سے اُترو
مرے پاس آؤ!!

چاپ

یہاں ــــ اب سے کچھ دیر پہلے
سیہ زنگ آلود پہیوں کے رُکتے سنبھلتے ہوئے شور میں
زرد آوارہ کتّے کی آواز
سینے کے زنداں کو توڑ کر
ایک قیدی کے مانند باہر کو اُڑنے لگی تھی!
وہ گھائل سسکتی ہوئی چیخ
اب لاکھوں کرچوں میں بٹ کر، کراہوں میں ڈھل کر
نگاہوں کے غرفوں میں خنجر چھپائے
اندھیرے کے پُرہول بَن کی تہوں میں اُترنے لگی ہے
اُترتی چلی جا رہی ہے

میں اس اندھی آواز سے بچ نکلنے کی خاطر
ہزاروں جتن کر چکا ہوں
دہکتی ہوئی سانس کو اپنے سینے میں روکے
لہو سے تہی، برف سی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے
اندھیرے کے جنگل میں دبکا پڑا ہوں
مگر کیا کروں
اس —— تعاقب میں آتی ہوئی چاپ کو کیا کروں؟

رُکنے کے بعد

ذرا دیر کو میں رُکا تھا کہ اِک شاخ ٹوٹی
پرندا کوئی ڈر کے چیخا
گھنی، سرسراتی ہوئی جھاڑیوں سے
کوئی شُوکتا سانپ لہرا کے نکلا
جُھکی ڈال اِک دل جلے پیڑ کی کسمسائی
کہیں دُور جھینگر نے بنسی بجائی
اندھیرا ہوا اور بھی کچھ گھنیرا
لرزنے لگا خوف سے جسم میرا!

میں بڑھتے ہوئے تُند، پُرشور سیلاب کا ہم نوا تھا
مگر آج اِک گہری کھڈ میں گرا ہوں — رُکا ہوں

کف آلود لہروں کے سیلِ بلا خیز سے کٹ گیا ہوں
تو اِس ٹین کے جسم کی چھت پہ گرتی ہوئی
ایک اِک بُوند سے آشنا ہوں !!

نروان

مری سانس کا سلسلہ
ایسے ٹوٹے ۔۔ کہ اک مست جھونکے کے مانند گرتی لڑھکتی ہوئی عمر مری
ہری، لانبی، مخمل سی، خوشبو بھری گھاس میں
اپنے ننگے بدن کو اُتارے
نہ آنسو گرائے نہ دامن پسارے
فقط ہاتھ کے الوداعی اشارے سے
اپنے تعاقب میں آتے پرندوں کو رخصت کرے
اور خود گھاس کی جھیل میں ڈوب جائے!

مری سانس کا سلسلہ
یوں نہ ٹوٹے ۔۔ کہ اِک تند جھونکے کے مانند اُڑتی ہوئی عمر میری

کسی بند، اُجڑے ہوئے شہر میں دفعتاً خود کو پائے
بھیانک خموشی کا اک ڈولتا قہقہہ
اُس کی رگ رگ میں اُترے — تو وہ بوکھلائے
قطاروں میں لیٹی ہوئی مُردہ گلیوں میں بھٹکے
مکانوں میں اُترے، منڈیروں پہ آئے
سیہ چھوٹی اینٹوں کی فرسودہ دیوار کو اپنی پوروں سے چھُو کر
کوئی درز ڈھونڈے، کوئی راہ مانگے
اچانک کسی سرد کھمبے کی بے نُور آنکھوں سے جھانکے
بڑے کرب سے گڑگڑائے
"خدارا کوئی مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ بتائے
خُدارا کوئی مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ بتائے"۔

دن کا زرد پہاڑ

کوہِ ندا کے سحر میں گم سارا شہر تھا
اور شہر کے فسوں میں گرفتار ہم بھی تھے

کوزوں کے ساتھ ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں
اُس شہرِ بے مثال کے آثار ہم بھی تھے

نردبان

"دن کا زرد پہاڑ"! ——— میری نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے!

مجھے صدیوں پرانی ایک بھولی بسری ہوئی کہانی یاد آرہی ہے۔ ایک شام داستان کا مسافر ڑے کوس طے کرتا ہوا کسی ایسے شہر میں پہنچا جس کے گھروں اور دکانوں کے دروازے کھلے تھے لیکن سارے شہر میں ایک بھی ذی روح موجود نہیں تھا۔ مسافر جب گھبرا کر اس شہر سے باہر یا تو اُسے ایک پہاڑ کے دامن میں شہر کے تمام مرد و زن سر جھکائے خاموش کھڑے ہوئے منتظر ئے۔ اچانک پہاڑ پر سے ایک تیز، بھیانک چیخ میں تبدیل ہوتی ہوئی آواز آئی اور مہر بلب ہجوم یں سے ایک شخص بے اختیار سا ہو کر پہاڑ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ کسی مخفی ڈور سے بندھا ہوا پہاڑ پر ڑھتا چلا گیا اور پھر چوٹی پر سے دوسری طرف کو کود گیا۔ مسافر نے حیران ہو کر اپنے قریب کھڑے وئے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی یہ کیا ماجرا ہے؟ اور شہر کے باسی نے جواب میں کہا کہ ہر ہفتے کی ام کو شہر کے تمام لوگ اس میدان میں جمع ہوتے ہیں اور اس پُراسرار آواز کا انتظار کرتے ہیں۔ کیا یر کوہ ندا سے کس کے لئے بلاوا آجائے؟ مگر جو شخص ایک بار اس چوٹی کو عبور کر گیا، وہ پلٹ کر

کبھی نہ آیا۔

میرے لئے اور مجھ ایسے لاکھوں افراد کے لئے ہر نیا دن، اسی پہاڑ کا بُلاوا ہے — ایک ندا جس کی ڈور سے بندھے ہوئے ہم سب کسی انجانی منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر وہاں نہیں آتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ یہ بلاوا کب سے ہے؟ یہ بلاوا کب تک رہے گا؟ یہ بلاوا کیوں ہے؟ —— مگر شاعر ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ ہر روز جب صبح پھوٹتی ہے تو اُس کے سامنے دِن کا زرد پہاڑ سینہ تانے آکھڑا ہوتا ہے اور پھر اس کی چوٹی سے ایک تیز، بھیانک چیخ میں تبدیل ہوتی ہوئی آواز، مسلسل — متواتر ....

اور یہ نظمیں!

یہ نظمیں تو صرف اُس کرب کے اظہار کی ایک ناتمام کوشش ہیں جو زرد پہاڑ کے بُلاوے پر شاعر کے دِل میں پیدا ہوا اور پھر اس کی نس نس میں دوڑتا چلا گیا!

وزیر آغا

سرگودھا۔ یکم جنوری ۱۹۶۹ء

ترتیب

حادثہ	۱۹۵۸	۳۲۷
عرفان	۱۹۵۹	۳۲۸
لمس	۱۹۶۲	۳۳۰
شب خون کے بعد	۱۹۶۵ جنوری	۳۳۲
سال کا پہلا دن	۱۹۶۵	۳۳۴
یاترا	۱۹۶۵	۳۳۶
بانجھ	۱۹۶۵	۳۳۸
روایت	۱۹۶۵	۳۴۰
ڈھلتی ساعت	۱۹۶۵	۳۴۱
کٹھور راہیں	۱۹۶۵	۳۴۳
فشار	۱۹۶۵	۳۴۵

پیش گوئی	۱۹۶۵ اگست	۳۴۷
جنگ کی ایک رات	۱۹۶۵ ستمبر	۳۴۹
سیز فائر	۱۹۶۵	۳۵۱
ایک تصویر	۱۹۶۵	۳۵۲
یلغار	۱۹۶۵	۳۵۲
اگنی کُنڈ	۱۹۶۵	۳۵۵
ریاکار	۱۹۶۵	۳۵۶
کالک	۱۹۶۵	۳۵۸
المیہ	۱۹۶۶	۳۶۰
اندھاکنواں	۱۹۶۶	۳۶۲
سگِ زرد	۱۹۶۶	۳۶۴
ماں (پہلا رُوپ)	۱۹۶۶ ۲۴ اپریل	۳۶۶
ماں (دوسرا رُوپ)	۱۹۶۶ ۲۵ اپریل	۳۶۸
درماندہ	۱۹۶۶	۳۷۰
نفرت	۱۹۶۶	۳۷۲
بوجھل خوشبو	۱۹۶۶	۳۷۴
سلسلہ در سلسلہ	۱۹۶۶	۳۷۶
کوہِ ندا	۱۹۶۷	۳۷۷
لاوا	۱۹۶۷ جون	۳۷۹
رَت جگا	۱۹۶۷	۳۸۱

ہتھیلی	۱۹۶۷	۳۸۳
خدشہ	۱۹۶۷	۳۸۵
مِلن	۱۹۶۷	۳۸۷
ترغیب	۱۹۶۸	۳۸۹
اُدھڑتا لمحہ	۱۹۶۸	۳۹۱
ڈھلوان	۱۹۶۸	۳۹۳
مراجعت	۱۹۶۸	۳۹۴
مرگھٹ	۱۹۶۸	۳۹۶
ایک شام	۱۹۶۸	۳۹۸
شاعر	۱۹۶۸	۴۰۰
ندھی کالی رات کا دھبّہ	۱۹۶۸	۴۰۱

کواڑ بجتے تھے اور دل مرا لرزتا تھا
مَیں برگِ سبز تھا لیکن ہوا سے ڈرتا تھا

حادثہ

سکوت کے لب سِلے ہوئے تھے
تھکی ہوئی رہگزر لپٹ کر
خروش پیڑوں سے — سو چکی تھی
لُڑھکتے پتھر بھی تھم گئے تھے
ہوا کا رتھ گہرے کھڈ میں گر کر
ہزار قاشوں میں بٹ چکا تھا
ڈرے ہوئے خوش نوا پرندے
دبیز پتوں، گھنیری شاخوں کے
کالے کمبل میں گم پڑے تھے
تھی اس قدر بے کراں خموشی
تھا اس قدر دم بخود اندھیرا
کہ میں تھکی رہگذر سے لگ کر
گزرتے لمحوں کی چاپ تک کو
خود اپنے کانوں سے سن رہا تھا!

عرفان

سرکش لہریں ــــــ اُبھریں، ڈوبیں
ساحل کی باہوں میں جھُولیں

بجرے سے میں ایسے نکلوں
جیسے پھُول سے باس
تیز ہوا کا اُڑن کھٹولا
دَوڑ کے آئے پاس
اُڑن کھٹولے میں اُڑتا میں اُڑوں تیری اور
اُوپر چاند سلونا ناچے، دھرتی پر اک مور
پتّے تالی پیٹ کے چہکیں، پھلواری لہرائے
نغمہ مُدھر الاپ میں ڈھل کر مُجھ کو راہ دکھائے
نغمے کے دامن کو تھامے

اندھے سادھو کی صورت میں
مُسکاتا بڑھ جاؤں
ساحل کی باہوں کو تج کر
طوفانی لہروں میں ڈھل کر
خود ساگر بن جاؤں!

○

لمس

پَو پھٹتی ہے
نرم، سفید اُنگلی اُوشا کی
گُدگُدیاں کرنے لگتی ہے،
کپڑوں کے انبار میں ہر سُو
مکڑی سی بن کر پھرتی ہے
ننھے مُنّے اَبر کے ٹکڑے
گال گُلابی، اَنگ تھرکتے
چاروں جانب ہنس ہنس گرتے
دُور اُفق کی دہلیزوں سے
اپنے زور میں ٹکراتے ہیں
گٹھڑی سی بنتے جاتے ہیں

دِن ڈھلتا ہے!

تھکا ہوا راہی رُکتا ہے
شام کا گہرا ، لانبا سایہ
پُورب کی جانب بڑھتا ہے
رات بچاری، دُکھ کی ماری
سر پر کالی چادر لے کر
پلکوں پر کچھ دیپ جلا کر
بوڑھے کالے ہاتھ سے چھٹے
اِک اِک بادل کے ٹکڑے کو
آوارہ ننگے بالک کو
بہلاتی ، واپس آتی ہے
اور بادل روتے جاتے ہیں

شبِ خوں کے بعد

بھرے شہر پر ایک پَل کے لیے
اُبر کا کوئی شب رنگ ٹکڑا اُڑ کا
اِک ادھڑتا ہوا قہقہہ شہر کے باسیوں کو سنائی دیا!

ہراساں نگاہوں میں اک خوف کی کپکپاہٹ سی اب تک رواں ہے
کواڑوں کی لرزش، منڈیروں کے اَوراق
اِک خوں میں ڈوبی ہوئی داستاں ہے
گلی مر چکی ہے
مگر اس کی اُبلی ہوئی زرد آنکھوں،
کُھلے اور اکڑے ہوئے منہ پہ اب بھی
کسی خوف کا بھوت نوحہ کُناں ہے!

کُھلی شاہراہوں پہ جلتے ہوئے قمقموں کی قطاریں

منوّر دُکانوں کی الماریوں میں
منقّش لبادوں میں لپٹی ہوئی مردہ گڑیاں
مگر دُور تک کوئی انساں کہاں ہے ؟
عجب بے حسی ہے
کُھلی شاہراہوں پہ، بھیگے ہوئے راستوں پر
فقط مُردہ پھُولوں کا لشکر رواں ہے !

گلی مر چکی ہے
مگر کوئی ایسا نہیں ہے
جو آگے بڑھے :
اور مُردہ گلی کی پھٹی زرد آنکھوں میں جھانکے
لرزتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں سے
اپنی جوا نمرگ دختر کے زخموں سے چھلنی بدن پر
سیہ بھیگے آنچل کا سایہ کرے
اور خود پھُوٹ کر رو پڑے !!

○

سال کا پہلا دِن

اُس جانب تھے
بھاری، تیز، مُڑے ہوئے سینگ
نتھنوں سے نخوت کی بھاپ کے مرغولے
کالا سُم صدیوں کی دھُول لیئے!

اِس جانب تھا
خُون میں لِتھڑا، خاک میں اُلجھا جسم
خُشک زباں بے نُطق،
نظر اِک ٹُوٹا پھُوٹا خُم
چیخوں کے مرگھٹ میں جیسے
اِک راہی — گم سُم!

جسم اور سُم کے ٹکراؤ میں
پھُوٹی شاخ ہری
چاروں جانب بڑھ کر پھیلی
اِک آواز نئی !!

○

یاترا

یہ دِن اک شجر ہے
جو چھلکے کے ملبُوس سے اپنے ننگے بدن کو جُدا کر کے
تاروں بھری کینچلی کو پرے پھینک کر
کالی، اندھی زمیں کی کسی درز سے جھانکتا ہے!
"کہاں ہوں، یہ کیسا جہاں ہے، یہ لیلا رچائی ہے کس نے؟"
—— نہیں جانتا ہے!
ہَوا ناچتی ہے فلک پر جواں بادلوں کے ہنڈولے
بھری چھاگلیں، لاکھ رنگوں کی پچکاریاں اپنے ہاتھوں میں لے کر
تعاقب میں آتے ہیں اُس کے تو وہ کانپتا ہے!
معاً نرم برکھا کے پہلے ہی چھینٹے پہ وہ گنگُناتا کر
ہزاروں معانی سے لبریز اک مسکراہٹ نگاہوں میں لا کر
حسیں شاخچوں، پتیوں، شوخ پھُولوں میں ڈھلتا ہے

——— اور جاننا ہے !!

مَیں جب اُس سے کہتا ہوں
تاروں بھری کینچلی، زرد چھلکے کے ٹھنڈے مکاں میں
تُجھے شانتی مِل سکے گی
تو وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہے
مُجھے جیسے صدیوں سے پہچانتا ہے

○

بانجھ

چھتوں، منڈیروں اور پیڑوں پر
ڈھلتی دھوپ کے اُجلے کپڑے سُوکھ رہے تھے
بادل، سُرخ سی جھالر والے بانکے بادل
ہنستے چہکتے پھُولوں کا اک گلدستہ تھے
ہر شے کُندن رُوپ میں ڈھل کر دمک رہی تھی
گالوں پر سونے کی ڈلک اور آنکھوں میں اِک تیز چمک تھی
سارا منظر کیف کے اِک لمحے میں بے بس،
لذت کی بانہوں میں جکڑا ہُمک رہا تھا!

اور پھر وہ آنکھوں کو ملتی
کالے، اُلجھے بالوں کو مُکھ پر بکھرائے
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑھتی آئی

پہلی کھڑکی میں جب اُس نے جھانک کے دیکھا
کھڑکی کی دہلیز پہ رکھا اِک نازک گُلدان چیخ کر ٹوٹ گیا
اُلجھے بالوں، پاگل آنکھوں والی نے تب آگے بڑھ کر
دُوسری، تیسری، اور پھر گلی کی ہر کھڑکی میں جھانک کے دیکھا
گُل دانوں کو ٹھوکر ماری
اِک اِک پھُول کو روند دیا!

تب وہ مجھ کو دیکھ کے لپکی
میری جانب غیض بھری نظروں کا ریلا آیا
پھر جیسے کچھ سوچ کے ٹھٹکی
سُرخ گلاب کا پھُول مرے ہاتھوں میں تھمایا
اور خود چکنے فرش پہ گِر کر ٹوٹ گئی!!

○

روایت

وہ — اِک ریشمیں کالے بُرقع میں لپٹی
دہکتے ہوئے اپنے گالوں کو باریک سی چلمنوں میں چُھپائے
فقط دو بڑی موٹی موٹی سی آنکھوں سے
ہر آنے والے کو تکتی ہے
اور زخم کھا کر
لرزتی ہوئی لانبی پلکوں میں خود کو چُھپا کر
عجب بے بسی سے
پُرانے سے اِس کُبڑے آکاش کو گھورتی ہے!

وہ صدیوں سے
بڑھتے ہوئے وقت کے راستے میں
لبوں کو سیئے، دم بخود، بے سہارا کھڑی ہے
مگر ایسے لگتا ہے جیسے وہ ہر آنے والے کے شانے سے واقف ہے
ہر تُند جھونکے کو پہچانتی ہے!!

ڈولتی ساعت

سلونی سی اک شام
اور لاکھ رنگوں کی جوالا میں بھیگا ہوا کوئی لمحہ
انگوٹھی کے پاتال میں اِک نگینے کے مانند ہنستی ہوئی کوئی ساعت
چمکتا ہوا وہ سماں جب کسی ڈولتے پل کو جھولا بنا کر
لجا کر
عجب میٹھی نظروں سے میری طرف تُو نے دیکھا
ہر اِک سمت سے بے خبر، لفظ و معنی کے رشتے سے ناآشنا
کوئی اندھا لرزتا ہوا ایک جُملہ ترے کپکپاتے ہوئے نرم ہونٹوں پر آیا
تو اِک جگمگاتے ہوئے پَل میں ڈھل کر
مرے ذہن کی تیرگی میں اُجالے کا روشن ستوں بن گیا!

مگر تُو نے یہ بھی تو دیکھا
اِدھر شام کی جوالا ٹھنڈی پڑی اور اُدھر

کہنہ بیساکھیوں کے سہارے، اپاہج سی اِک بُڑھیا
بے دانت کے پوپلے منہ سے سیٹی بجاتی ہوئی سامنے آ کے رُک سی گئی

اور پھر
رات بن کر
تجھے ڈس گئی
پھر مجھے ڈس گئی!

وہ لمحہ کہ جس کے لیے ہم نے لمبی مسافت کا ہر دُکھ اُٹھایا
فقط ایک پل تھا
پہاڑوں میں بل کھاتی وحشی ندی پر
درختوں سے لٹکا ہوا
کچے رستوں کا اِک پُل!!

○

کٹھور راہیں

کٹھور راہیں
جو اُلجھے دھاگوں کا ایک گچھا سا بن گئی ہیں
نہ ان کو رنگوں کی تیز برکھا سے کچھ غرض ہے
وہ تیز برکھا جو منہ اندھیرے
کسی پُجارن کے کپکپاتے سفید ہونٹوں پہ ناچتی ہے
نہ ان کی منزل وہ شامِ غم ہے جو ایک میلا سا طشت لے کر
مُسافروں سے لہو کے قطروں کی بھیک رو رو کے مانگتی ہے
دہکتے تارے، ٹکھی دعائیں، لرزتے ہاتھوں سے بانٹتی ہے
کٹھور راہیں تو آگے بڑھ کر، ادا دکھا کر، پلٹ گئی ہیں
پلٹ کے پہلو بدل گئی ہیں!

گھنیری شب اپنی کالی کملی میں گم کھڑی ہے

یہ سوچتی ہے،
بھنوّر کی بے نُور چشمِ تر میں
کوئی سا سیدھا سفید رستہ اُبھر کے چمکے
تو شب کا راہی اُدھر کو لپکے!

یہ شب کا راہی
سمے کے دھارے پہ بہتے بہتے بھنوّر کی صُورت اُلجھ گیا ہے
ہزار راہوں میں گھِر گیا ہے!!

○

فشار

رات سیہ چادر میں تن کے بھید چھپائے
اندھے غار سے باہر آکر
اپنا سب کچھ ہار گئی ہے!

سورج کی مقراض بڑی پھرتی سے چلتی
کالی، بوجھل چادر کو بے ڈھب ٹکڑوں میں بانٹ رہی ہے
تیز ہوا لانبے چابک سے
کٹے پھٹے جسموں کو ہر سو ہانک رہی ہے!

عجب، سماں ہے!
کوئی بتاؤ کہاں گئی وہ رات کی خوشبو
صدیوں کی مدھم سی لَو جو تاروں سے چھن کر آئی تھی

میرے دِل میں کانپ رہی تھی !

دِل اِک ننگی لاش کی صُورت
چورا ہے میں آن گرا ہے
سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کے بے دردسُموں سے
لاکھوں پُرزوں میں کٹ کر
بِکھر گیا ہے !!

○

پیش گوئی

ہنسا کھوکھلی سی ہنسی
اور پوتھی پہ اِک ہاتھ رکھ کر
مجھے گھُور کر
گنگنایا :
یہاں سے وہاں تک
مجھے ایک بھی سبز پتّہ دکھائی نہیں دے رہا
ایک بھی بانسری کی مدھر تان
پانی کی گاگر کے نیچے چھلکتی ہوئی وحشی ہرنی سی آنکھیں
کوئی ایک چمکیلا آنسو بھی باقی نہیں ہے!
دھُواں، راکھ اور حزن
دھرتی کی اُجڑی ہوئی کوکھ میں چند جھُلسی ہوئی ہڈیاں
ادھ جلے پریم پتّروں کے ڈھانچے

درختوں کی لاشیں
مکانوں کی اُڑتی ہوئی دھجیاں
سُونے رستوں پہ پھرتی ہوئی کھوکھلی سی ہوا کے سوا
اور کچھ بھی مجھے یاں دکھائی نہیں دے رہا!

بڑی دیر تک میں نے بوڑھے نجومی کی باتیں سُنی
اور آباد راہوں پہ خوش پوش جوڑوں کو آنسو کی چلمن سے دیکھا کیا
پھر اچانک
نہ جانے کہاں اِک بِگل سا بجا
اور نہ جانے وہ کیسے نِکل کر مرے سامنے آگیا
ایک بھینگا، مڑے ناخنوں والا عفریت
جو پہلے دن سے
مری آنکھ میں چھُپ کے بیٹھا ہوا تھا
مرے خون پر پَل رہا تھا!!

○

جنگ کی ایک رات

رات ڈھلتی ہے تو چاند
زہر میں ڈُوبی نگاہوں سے ہمیں گھُورتا ہے
اور پھر جیسے اشارے سے بُلاؤں کو بُلا لیتا ہے

خندقیں،
شام سے منہ کھولے ہوئے بیٹھی ہیں
شب کے منحوس پرندے کے پَروں کی آواز
جب اُبھرتی ہے تو یہ خوف سے تھرّاتی ہیں

ہر طرف کرب میں گوندھی ہوئی تاریکی ہے
کھیت، زہریلی نگاہوں سے ہوئے ہیں چھلنی
اور ہم چھوٹی سی، تاریک سی اِک خندق میں

اپنے پَر بچّوں پہ پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں

خوف کے دائرے بُنتا ہوا منحوس پرند
ہم پہ منڈلاتا چلا جاتا ہے !!

○

سیز فائر

معاً
اِک اشارہ ہوا
تیرگی کھلکھلا کر ہنسی
موتیوں ایسے دانتوں نے
چہرے کی دیوار پر
چند نورانی سطریں سی لکھ کر کہا:
شکریہ! شکریہ!
اور لوگوں نے اپنی نشستوں سے اُٹھ کر
بڑے زور سے تالیاں پیٹ کر
اپنے اپنے ٹھکانوں کا رستہ لیا!

تیرگی کی دریدہ قبا

ایک تصویر

زمیں تیرگی کا سمندر
فلک، سُرخ تاروں کا گنجان جنگل
زمان و مکاں، موم کے نرم ٹکڑے
ہوا سانس روکے!
سمندر کی بے نُور چادر
کسی ایک سلوٹ
کسی اِک شکن سے بھی ناآشنا
دَم بخود پیڑ جیسے سپاہی
نئی وردیوں میں کسے
سخت لوہے کی کالی سلاخوں میں گُم
خوف کا کرب
گہرے بہت گہرے کھڈ کی طرح:
پھیلے آکاش سے ہولے ہولے ٹپکتا لہُو
قطرہ قطرہ سمندر میں گرتا ہُوا!!

یلغار

ذرا زرد تاروں سے نظریں ہٹا کر
مری بھیگی پلکوں کے جنگل میں آؤ
مری آنکھ کے غار میں جھک کے دیکھو
جہاں آج اِک بھولی بھٹکی کرن تک بھی باقی نہیں ہے!

اندھیرے کی ڈائن نے شہروں
چمکتے مہکتے ہوئے خوبصورت گھروں
اور گھروں میں دمکتے ہوئے
دُودھیا قمقموں ہی کو نِگلا نہیں ہے
وہ سینے کے معبد میں گھُس کر
ہزاروں برس سے مقفل پڑی میری پُونجی
مری رُوح کا سوز

دِل کی تپش
اور قرنوں سے چھپے ہوئے
روشنی کے خزینے کو بھی کھا گئی ہے!

○

اگنی کُنڈ

وہ جو کبھی نیلا پربت تھا
تانبے کے اِک تھال میں ڈھل کر
دھیرے دھیرے سُلگ رہا ہے!

جلتے ہوئے آکاش کی چادر
دیواروں تک جھک آئی ہے
ہر سُو راکھ اُنڈیل رہی ہے

کھولتے پربت کی چوٹی پر
تُو کِس گہری سوچ میں گم ہے
تُجھ کو یہ بھی خبر نہیں ہے
جھولی میں تو کنکر بھر کر
اگنی کُنڈ کو چھیڑ رہا ہے!!

○

ریاکار

اِک پاگل سا جھکّڑ شب بھر گلیوں میں غُرّایا
اپنے وحشی ناچ سے جس نے سب کا دِل دہلایا
رات بُجھی تو نٹ کھٹ سا اِک جھونکا بن کر آیا

نٹ کھٹ سا اِک جھونکا آیا، مُسکاتا اور گاتا
زخمی پیڑوں، گھائل کھمبوں کے تَن کو سہلاتا
ٹُوٹے پھُوٹے زرد مکانوں میں کِرنیں بِکھراتا

بولا چُن کر بِکھری کِرچیں اور پتّھر کا ٹکڑا
"چھوڑو یارو بیتی باتیں! ختم کرو یہ دُکھڑا
پونچھو آنسُو، روکو سِسکی، اَب دھو ڈالو مُکھڑا"

رات آئی تو نٹ کھٹ جھونکا ہو گیا پھر پاگل
کچے ہو گئے زخم پرانے، ٹھہر گیا ہر پَل
وہی ہُوا کی وحشی چھاگل، وہی برستا جَل

کالک

چاند ہنسا
کرنوں کی برکھا، اِک ٹوٹے سے ہار کی صُورت
بکھر گئی، پامال ہوئی!
دھرتی پر جو بھی گرتا ہے
پاؤں اُس کو روند کے آگے بڑھ جاتے ہیں
مَیں بھی دَمکتے چاند کا باسی
ہار کا اِک موتی تھا
اور مَیں اِک دِن صُبح سویرے خاک پہ آن گرا تھا
اور میری بھیگی پلکوں پر اِک معصوم سا اُجلا آنسُو
چمک اٹھا تھا
وہ بھی کیسا دن تھا ہر شئے بھیگ گئی تھی
ہر سُو بے حِس پتھر ٹپ ٹپ پگھل رہے تھے
چاند کے منہ سے ہنسی کا فوّارہ پھُوٹا تھا

اور دھرتی پر کالک بن کر بیٹھ گیا تھا!

تُم روتی ہو!
لیکن اس رونے سے اب کیا ہوتا ہے
کرنوں کی برکھا کے اِک لمحے کی خاطر
ساری عمر کا رونا بھی جائز ہے
وہ چمکیلا ہار جو اُس دِن ٹوٹ گیا تھا
اُس کے موتی یُوں بکھرے ہیں، اس ڈھب سے پامال ہوئے ہیں
تُم چاہو بھی —— پھر سے ان کو اک دھاگے میں لے آنا
ممکن ہی نہیں ہے
ہر موتی، ہر زردکرن، ہر قطرۂ خوں اب خود اِک چاند بنا ہے
اور تُم جانو چاند کے اس تازہ بہروپ سے اِک دِن
پھر کرنوں کا فوّارہ سا پھُوٹے گا
دِل ٹوٹے گا
اور خون کے بوجھل قطرے اِس بے نُور خَلا میں
شبنم کے ریزوں کی صُورت
دمک اٹھیں گے!!

○

المیہ

کہاں اب کہاں وہ ہَوا
جو سُنہری سی الھڑ سی، پگڈنڈیوں پر
مرے پیچھے پیچھے چلی —— میں نے جس سے کہا:
یوں نہ آ، دیکھ لے گا کوئی!
وہ ہنسی
زہر میں ڈوبے ہونٹوں نے مجھ سے کہا:
تُو یونہی ڈر گیا
مَیں —— ہَوا
دُور پربت پہ میرا نگر
اُونچے آکاش پر میرا گھر
زرد پگڈنڈیوں سے مجھے واسطہ؟

اُور مَیں بڑھتا گیا

اُونچا اُٹھتا گیا
دُور پربت پہ پہنچا تو گونگا نگر مُجھ کو حیرت سے تکنے لگا
سُونے آکاش سے
ٹُوٹے تاروں کی کرچیں برسنے لگیں
نیچے پگڈنڈیوں پر بھی کوئی نہ تھا!!

○

اندھا کنواں

چلو رہگزر کو یہاں چھوڑ دیں
سنگ ریزوں کے بستر پر اُتریں
اُسے ___ گہری پاتال میں جا کے ڈھونڈیں!

عجب تیرگی ہے
اندھیرے کی دیوار چاروں طرف سے اُمڈ کر
لڑھکتے سنبھلتے ہوئے پتھروں کی گھنی گہری آواز میں ڈھل گئی ہے
چلو اس کے دامن سے لگ کر
ذرا اور ___ کچھ اور نیچے چلیں
گہری پاتال تک اس کا پیچھا کریں!

فضا بُجھ چکی ہے

وہ آنسو جو پلکوں کی دہلیز تک آ کے
سفّاک جھونکوں کے چابک سے گھبرا کے واپس گیا تھا
سیہ آنکھ کے سال خوردہ سے اندھے کنویں میں
کسی سنگ ریزے کی صورت زمیں پر پڑا ہے!
اندھیرے کی دیوار
چاروں طرف سے اُمڈ کر
سیہ آنکھ میں گر رہی ہے
چلو ــــ اور نیچے چلیں
اُس چمکتے ہوئے سنگ ریزے کے نیچے
نم آلود دھرتی تو موجود ہو گی
وہیں چل کے ٹھہریں
وہیں رُک کے دیکھیں!

چلو رہگذر کو یہاں چھوڑ دیں!!

○

سگِ زرد

اور پھر اک دن ظالم سُورج
اپنی خُونی آنکھ سے مجھ کو گھُور رہا تھا
اُور میں پیلی گھاس میں چھُپ کر بیٹھ گیا تھا
پھر جب صُبح کے اِک جھونکے سے
گھاس کی بھیگی مَیلی چادر چاک ہوئی تھی
خُونی سُورج مجھ کو اپنے سامنے بے بس پاکر
فرطِ خوشی سے ناچ اُٹھا تھا
اور مَیں ڈر کر
اِس خندق میں
اِس تاریک، ہجّی خندق میں
کُود پڑا تھا!

شام ہوئی ہے!

خُونی سُورج مغرب کی اُس کھڈ میں لہُو لہان پڑا ہے
اب میں اس خندق سے نکلوں، سوچ رہا ہوں
لیکن میں خندق سے کیسے نکلوں
سُورج کا مکار برادر
مشرق کی دیوار سے لگ کر چھُپا کھڑا ہے
اپنی بھینگی آنکھ سے مجُھ کو گھُور رہا ہے !!

○

ماں

(پہلا رُوپ)

وہ برگد کا اِک پیڑ تھی
جس کی مانوس، گہری، خُنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بِتائیں
وہ مخمل کا اِک نرم چھتنار تھی
جس کے پتّوں میں چُھپ کر
مہکتی ہوئی دُودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا
وہ پتّوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سُلاتی رہی
مُسکراتی رہی!

اور پھر ایک دِن

اِک بگولا اُٹھا

پیڑ جڑ سے اُکھڑ کر پَرے جا پڑا
اور چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے سارے پنچھی
بھیانک سی چیخوں کے کہرام میں اُڑ پڑے ـــــ آسماں کی طرف
پھر بکھرتے گئے چار سُو!

○

ماں

(دُوسرا رُوپ)

خموشی کے اس زرد لمحے سے پہلے
یہ محسوس ہوتا تھا جیسے
کوئی غم زدہ، بے نشاں چاپ
میرے تعاقب میں
اِک نرم جھونکے کی صورت چلی آرہی ہے
کوئی ہے — جو میرے عقب میں
محبت کی نمناک خوشبو بکھیرے
اُمڈتے ہوئے تیز شعلوں سے مجھ کو بچائے
مرے ہر قدم کی سلامت روی کے لئے
التجاؤں، دعاؤں کی برکھا میں خود کو بھگوے
مرے سر پر آنچل کا سایہ کئے

آ رہا ہے!

اور اب دفعتاً
غم زدہ بے نشاں چاپ رُک سی گئی ہے
تو لاکھوں بپھرتے قدم، انگنت تُند دھارے
جو دبکے پڑے تھے
عقب سے اُبھر کر
مری سمت تیزی سے بڑھنے لگے ہیں
جھپٹتے، لپکتے — چلے آ رہے ہیں!

○

درماندہ

رَس بھرا لمحہ
نجانے کن کٹھن راہوں سے ہو کر
آج میرے تن کے اس اندھے نگر میں
ایک پَل مہماں ہُوا!

رس بھرا لمحہ
سمے کی شاخ سے ٹُوٹا
مری پھیلی ہوئی جھولی میں گِر کر آج میرا ہوگیا

یک بیک
قرنوں پہ پھیلے کارواں نے جُھرجُھری لی — چل پڑا

رُس بھرے لمحے کا محمل
اونٹنی کی پُشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا
تُو رہ گیا!!

○

نفرت

گہری، میلی، آنکھ تھی اُس کی
سبزی مائل رنگ
ٹیڑھی، ترچھی ناک کے نیچے
کھُلے ہوئے جبڑے سے نِکلے
بھیڑیئے ایسے لانبے دانت
اور دانتوں کا گہرا خم!

اندھے غار سے باہر آکر
مُجھ سے لِپٹ گئی
گاڑ کے دانت مری گردن میں
گُم سُم کھڑی رہی
پھر جب مُڑی تو اُس کے ہونٹ لہُو میں تر تھے
اور وہ ہنسی پھر

چڑچڑے سے کا غذالیسی
اِک پھیکی، بے آواز ہنسی
اَور مَیں اپنا سب کچھ تج کر
سر اُس کے قدموں میں رکھ کر
اُس کا داس بنا!
اُس کا راز بنا!!

اب ہم سب اُس کے چیلے ہیں
ہم سب کی گردن پر اُس کا
خُونی بوسہ چمک رہا ہے!!

○

بوجھل خوشبو

باغیچے کے نامحرم سے اِک گوشے میں
شرمیلے پھولوں کا جھرمٹ
پاگل بھونرے، مدھ مکھیاں
اور چھلبل کرتے رنگیں کپڑوں میں اِٹھلاتی
نازک پریاں!
پھیکی گرم سی، دھوپ کی چادر
چادر — جس پر خوشبو
نٹ کھٹ، بانکی، تیز سی خوشبو
ناچ ناچ کر ہاری
پھر جب مست ہوئی
چِت لیٹ گئی!

اور اب

پھُولوں کے جُھرمٹ کے چاروں جانب
مدھ مکھیوں کا ایک عجیب حصار کھنچا ہے
اور جادُو کی اس نگری میں
لاکھوں پھُول اور لاکھوں بھَونرے
بے ہوشی کے ساگر کی لہروں میں گُم ہیں
ہاں وہ مَست، تھکی ہاری سی
چِت لیٹی ہوئی بوجھل خُوشبو
جاگ رہی ہے!

○

سلسلہ در سلسلہ

یہ طشتری زمین کی
سما گئی جو اِک بڑے سے طشت میں
جو اِک بڑے سے تھال میں سما گیا
جسے اِک اور بیکراں، مُہیب طشت کھا گیا!

یہ تیرا تن
زمیں کے ریگ زار پر بس اِک ذرا سا نقشِ پا
مگر مری حقیر سی نگاہ میں
سُلگتا بے کنار دشت
دہکتی گرم ریت سے اُٹا ہوا!

حقیر سی نگہ مری
حقیر تر سے ماورا
حقیر تر پہ خندہ زن!!

کوہِ ندا

صُبح سویرے
ایک لرزتی، کانپتی سی آواز آتی ہے:
سونے والو! تُم مالک کو بھول گئے ہو
تُم، مالک کو بھول گئے ہو!!
پھر چمکیلی مِل کا سائرن
ایک غلیظ، ڈرانے والی تُند صدا کے رُوپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں کے
تنگ، اندھیرے باڑے میں کُہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلّے کو ہانک کے لے جاتا ہے!
پھر انجن کی برہم سیٹی
میخ سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے

اور شب بھر کی نچُی ہوئی اِک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے!

پھر یک دم اِک سنّاٹا چھا جاتا ہے
اور مَیں گھڑی کی ظالم سوئیوں کی ٹِک ٹِک میں
دِن کے زرد پہاڑ پہ چڑھنے لگتا ہوں!

○

لاوا

فضاؤں میں اُڑتے ہوئے تُو نے دیکھا
مَیں اک بانجھ پتھر پہ ریشم کی ڈوری میں جکڑا پڑا تھا
مرے گرد تازہ لہُو کی گھنی بُو نے
اک دائرہ بُن لیا تھا!
مُجھے تُو نے دیکھا
تو اپنی مُڑی چونچ کھولی
پَروں کو سمیٹا
بھیانک سا اِک قہقہہ
گرم لاوے کی صُورت ڈھلانوں سے لڑھکا
جلی گھاٹیوں میں مچلنے لگا
راستے راکھ سے اَٹ گئے
بوڑھے سُورج کی ٹوٹی ہوئی قاش پر

سُرخ آندھی کی بے حِس ردا تن گئی
وقت پتھرا گیا!

سُنا ہے تُو اب کہہ رہا ہے
ترے دِل میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سمندر
تری آنکھ کے سنگِ لرزاں سے چشمے کی صورت اُبلنے لگا ہے
سُنا ہے ـــــ مگر تُو نہیں جانتا ہے
مرے جسم پر تُو نے جو گرم لاوا اُنڈیلا تھا
اب منجمد ہو چکا ہے!!

○

رَت جگا

عجب دُکھ بھری رات تھی
تُند بادل کے پاؤں تلے
خشک دھرتی کی روندی ہوئی لاش تھی
اَور مَیں کھڑکی سے لگ کر کھڑا
اِک کڑکتے گرجتے ہوئے ریچھ کو
جَست بھرتے، تباہی مچاتے ہوئے دیکھتا تھا
مگر مُجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی
کہ مَیں ایک دِل دوز سی چیخ سے اُس کو للکارتا
گڑگڑا کر یہ کہتا :
بس اب مجھ پہ کرپا کرو
میں بہت تھک چُکا ہوں
بہت پِس چُکا ہُوں !

وہ شعلے اُگلتا رہا رات بھر
اپنے پنجوں سے، دانتوں سے بھنبھوڑتا
لاکھوں پُرزوں میں دُنیا کو تقسیم کرتا رہا
اور مَیں
لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کو
گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں ڈوبی ہوئی بستیوں کو
بھیانک سی اک چیخ کے ساتھ
ختم ہوتے ہوئے دیکھتا تھا
مگر مُنہ سے کچھ بھی نہیں بولتا تھا!

اور اب
نرم سُورج کی لانبی، حسیں، مہرباں اُنگلیاں
یک بیک میرے چاروں طرف
دائرہ سا بنا کر کھڑی ہو گئی ہیں
مجھے پیار سے تک رہی ہیں
تو شاید کہ وہ جا چُکا ہے!!

○

ہتھیلی

ایک پتّا گرا
تُو نے آنسُو بھری تُند گالی سے جس کا سواگت کیا
ایک پتّا گرا

خُشک ہونٹوں پہ اپنی زباں پھیر کر
تُو نے اِک بار پھر اپنی بنجر ہتھیلی کو آگے کیا
ایک پتّا گرا

لال سُورج
جو دِن بھر پکے سیب کے رُوپ میں
تیرے سر پر لٹکتی ہوئی
بانجھ شاخوں کے جُھولے سے چپکا رہا
اَب کہاں ہے؟

وہ رنگوں کا طوفاں
تجھے جس کی خاطر ہتھیلی کی بنجر زمیں کو سجانا پڑا
اب کہاں ہے ؟
لرزتا ہوا لال سورج تو کالے سمندر کی جھولی میں گر بھی چکا
لو وہ پتا گرا !!

○

خدشہ

کُنج سے گھبرا کے نکلی زرد چڑیا اور پھر
اِک لرزتی شاخ پر پَل بھر رُکی
آسماں کی سمت اُڑ کر
پھر زمیں پر آ گئی !

جُھک پڑی شاخِ حنا اور ہر طرف
بھینی بھینی باس کے چشمے بہے
شال بُنتے ہاتھ تیرے رُک گئے

نُور کی برکھا
گھنے چھتنار کی چھلنی سے چھن کر آ گئی
میرے اوپر روشنی کی پتیاں بکھرا گئی
میرے سارے جسم کو سہلا گئی !

ڈر رہا ہوں یہ زمیں
یہ لڑھکتا اور اُدھڑتا سبز گولا اُون کا
ایک دن بے ڈھب سی لاکھوں کترنوں میں
خود بخود بٹ جائے گا
گُنگ اور تیرہ خلاؤں میں بکھرتا جائے گا
نُور کی سب پتیاں مر جائیں گی !!

○

مِلن

پَو پھٹتے ہی
دو بیتاب سی پیاسی آنکھیں
اندھی، سرد، اُداس گلی میں چمک اُٹھی تھیں
اُوپر کھڑکی کے پردوں سے
سُوجی ہوئی آنکھوں کی جوڑی
جھانک رہی تھی

تب سُورج اِک دیو کی صورت، آ پہنچا تھا
جس کے ماتھے کی اکلوتی، برہم آنکھ نے
سب آنکھوں کو خاک کیا تھا
سب انگارے راکھ ہوئے تھے

شام ہوئی ہے

شہر کے اندر مومی شمعیں
ڈرتے ڈرتے اپنی پیاسی آنکھوں کے پٹ کھول رہی ہیں
اور آفاق کی کالی چھت سے
تاروں کی سوجی ہوئی آنکھیں
جھانک رہی ہیں!

○

ترغیب

کبھی تُم جو آؤ
تو مَیں صُبح کے جُھٹپٹے میں
تمہیں سب سے اُونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
درختوں کے اک سبز کمبل میں لپٹا ہوا شہر سارا
کلس اور محراب کے درمیاں اُڑنے والے مقدس کبوتر
بہت دُور چاندی کے اک تار ایسی ندی
اُس سے آگے جری کوہساروں کا اِک سرمئی سلسلہ!

کبھی تُم جو آؤ
تو مَیں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں
تمہیں اپنے اس آہنی شہر میں لے چلوں
ایک لوہے کے جھُولے میں تُم کو بٹھاؤں

تمہیں سب سے اُونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
ملوں کے سیہ رنگ نتھنوں سے بہتا دھواں
تنگ گلیوں سے رِستی ہوئی نالیاں
جو مساموں کی صُورت
مکانوں کے جسموں سے گاڑھے پسینے کو خارج کریں
کھانستی، ہونکتی شاہراہیں
ہراساں، غصیلی تھکی ٹیکسیاں
پُرانے گرانڈیل پیڑوں کے کٹنے کا منظر
شکستہ عمارات کی ہڈیوں پر
مُڑی چونچ والے سیہ فام بُل ڈوزروں کے جھپٹنے کا وحشی سماں!

کبھی تم جو آؤ
تو میں تم کو پلکوں پر اپنی بٹھاؤں
تمہیں اپنے سینے کے اندر کا منظر دکھاؤں

○

ادھڑتا لمحہ

آنکھ ہنسی
پھر کالی کلوٹی رات ہنسی
پھر رات کا پنچھی
پھڑ پھڑ کرتا
میرے اوپر منڈلایا
اور ننگے مست پہاڑ نے یک دم
آنکھ جھکا کر
بھاری پتھر لڑھکایا
وہ پتھر دوسرے پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹا
لڑھک گیا
پھر اس کے سخت نکیلے ٹکڑے
لاکھوں لڑھکتے ٹکڑوں کا سیلاب بنے

اور ننگا مست پہاڑ ہنسا !

گرداب بڑھا
اور ہنسی کا حلقہ تنگ ہوا
مَیں کانپ اٹھا
مَیں ڈرنے لگا
تب مَیں نے اچانک
پھیلے ہوئے آکاش کی جانب
رحم طلب نظروں سے دیکھا
تاروں نے آکاش کو چھلنی کر ڈالا تھا
چاند
ادھڑتی ہنسی کا فوّارہ سا بن کر
ناچ رہا تھا !!

ڈھلوان

ایک ننگی چیختی آواز
پھر چابک کا شور
کھڑکھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیّوں کی صدا
اور میں آواز کے آگے جُتا!
میری آنکھوں پر نقاب
میرے منہ میں خاردار آہن کی جیب
میرے بازو
سخت چمڑے کے سیہ رستوں کے
برہم جال میں جکڑے ہوئے
اور میرے سُم
مرے چاروں رفیق
گھاٹیوں سے، پتھروں سے بے خطر
خندقوں سے بے نیاز!

مراجعت

رات بھر اِک صدا
تیز تلوار کی دھار ایسی صدا
قطرہ قطرہ مرے خون میں
پگھلے سیسے کے مانند گرتی رہی
میری رگ رگ میں گھُل کر بکھرتی رہی
اور بپھرے ہُوئے تُند ذرّوں کی صُورت
مرے جسم میں دوڑتی، جھجھناتی پھری!

صُبح ہونے کو ہے
کوئی دم میں یہ زخموں بھری رات کی گرم چادر
اُجالے کے صابن میں دُھل کر نکھر آئے گی
ہر طرف نرم نازک سی خوشیوں کے چھینٹے
کواڑوں کو چھیڑیں گے، سہلائیں گے

پھُول کھل جائیں گے
چہچہوں، قہقہوں کی جوالا
سیاہی کے دھبّوں کو کھا جائے گی!

سوچتا ہوں
وہ اِک تیز سی دھار ایسی چمکتی صدا
جس کی کرچیں مری ایک اِک رگ میں
پنجوں کو گاڑے کھڑی ہیں
کہاں جائے گی؟
اتنی صدیوں کے بن باس کو جھیل کر
اپنے گھر آئی ناری سے اب کس طرح مَیں کہوں؟
"جاؤ!
یہ گھر تو خوشیوں کی رانی کا گھر ہے"

○

مرگھٹ

گہرا، گھور اندھیرا!

گہرے گھور اندھیرے میں
اِک نُور کا دھبّہ
کبھی جلے، کبھی بُجھ جائے
پھر جل اُٹھے
پھر قرنوں تک
وہ نُور کا دھبّہ بھی نہ رہے
بس ایک غلیظ، مہیب اندھیرا
تیز ہوا کے ستونوں پر
اِک کالی چادر تنی ہوئی!

تب اندھیارے کا تن ڈولے

اور سُوکھے پیاسے ہونٹوں سے
کوئی لفظ گرے
اور تنی ہوئی چادر پر یک دَم
نُور کی سلوٹ جل اُٹھے
پھر بُجھ جائے
پھر جَلنے لگے!!

○

ایک شام

آخر اُسے ٹھوکر لگی
اور اُس کی بیساکھی گری
اور سُرخ سا اک ریشمی رُومال اُس کے ہاتھ سے
چھوٹ کر نیچے، بہت نیچے کہیں
سنگ دِل کوُچے کی اک اندھی لحد میں جا گرا
اور جھکتے نیر نے
پردے کے پیچھے سے نکل کر
اُس کا بازُو تھام کر سِسکی بھری
اُس کو اُٹھایا
اور کہا:
باجی! تُو کیسے گر پڑی!

شام نے دیکھا کہ یہ پہلا ستارہ

پیش رَو تھا اُن ستاروں کا
جو اَب چاروں طرف اُگنے لگے
دائرے میں اُس کو لے کر
دُکھ سے بوجھل، کرب میں گُوندھی ہوئی آوازیں
کہنے لگے،
ہم تجھے مرنے نہ دیں گے
ہم تجھے زندہ رکھیں گے
ہائے تُو کیسے گری
ہاں جی تُو کیسے گر پڑی!!

○

شاعر

وحشی لفظوں کے جنگل میں
وہ اِک ڈرا ہوا سا جرم ہے
چادر اس کی خون میں لت پت
اور بدن زخموں کا گھر ہے
کہاں سدھارے؟ رستے گم ہیں
کِسے پکارے؟ اندھیارا ہے
ہر جانب آواز اُگی ہے
ہر ٹہنی پر میلی آنکھیں
کالے موٹے لب لٹکے ہیں
سر پر تاروں کا چھتا ہے!

وحشی لفظوں کے جنگل میں
وہ اِک ڈرا ہوا سا جرم ہے
اور اس کی مخلوق یہ بونے
لفظوں کے خود کار کھلونے
لے کر اِک گھیرے میں اُس کو
اِک خونی زنجے میں اُس کو
توڑ کے سارے بچپن پرانے
ناچ رہے ہیں، نیزے تانے!!

اندھی کالی رات کا دھبّہ

اُونچی نیچی دیواروں میں گھرے ہُوئے
تُم اتنے ہراساں، اتنے تنہا
پہلے کب تھے؟

جاؤ پھر سے کھاٹ پہ لیٹو
ٹکٹکی باندھ کے اُس کو دیکھو
کتنا بے بس، کتنا بھیانک، کتنا تنہا!
ڈولتا پہیہ، کھوٹا سکہ، اندھی کالی رات کا دھبّہ
تُم نے اس دھبّے کو اب تک پیشانی کی شوبھا سمجھا
اور اب خالی برتن بن کر چیخ رہے ہو!

بولو، اپنے ہونٹوں پر کوئی شبد سجاؤ

منتر جاپو، ہاتھ اٹھا کر پڑھو دُعائیں
چہرہ دھو کر، سیدھے ہاتھ کی اُنگلی کے یاقوت میں جھانکو
بولو، تم نے کیا دیکھا ہے؟

صدیوں تم نے اُس کو چاہا
اُس کی سیمیں اُنگلی تھامی، چلنا سیکھا
اُس کے ٹھنڈے نورانی چھتنار کے نیچے
گھاس پہ بیٹھے
دُودھ بھری کرنوں میں نہائے
پیار بھری آنکھوں میں جھانکا!

اَور اب کیا ہے؟
اِک نُقطہ، اِک ڈولتا پہیہ، اندھی کالی رات کا دھبہ
نیست کا پیکر، بے رنگی کا مظہر، تنہا!
اس کو اب تم کیا دیکھو گے
دیکھا بھی تو
اپنے ہی اندر جھانکو گے!!

○

نردبان

کیسے کہوں کہ مَیں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ، زمیں بے لباس تھی

ترتیب

زردبان — وزیر آغا		۴۰۷
جب آنکھ کھلی میری	۱۹۶۹	۴۱۷
ذات کے روگ میں	۱۹۶۹	۴۲۰
آنکھ بھنور کی	۱۹۶۹	۴۲۲
بُجھی راکھ کا انگ	۱۹۶۹	۴۲۴
سلومی	۱۹۶۹	۴۲۶
سفر کا دوسرا مرحلہ	۱۹۷۰	۴۲۸
کہانی	۱۹۷۰	۴۳۰
ہُوا کہتی رہی آؤ	۱۹۷۰	۴۳۳
اشومیدھ یگیہ	۱۹۷۰	۴۳۵
بھُوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں	۱۹۷۱	۴۳۷
سُورج کے آنے سے پہلے	۱۹۷۱	۴۳۹
آویزش	۱۹۷۱	۴۴۱
ٹین کا ڈبّہ	۱۹۷۲	۴۴۳
ناموجود کے بھاری دَر پر	۱۹۷۳	۴۴۵
نشتر گاہ	۱۹۷۳	۴۴۷
دکھ میلے آکاش کا	۱۹۷۳	۴۴۹
اک نقش پیارا	۱۹۷۳	۴۵۱
آمد	۱۹۷۳	۴۵۳

سیلِ بلا	۱۹۷۳	۴۵۶
عجیب ہے یہ سلسلہ	۱۹۷۴	۴۵۸
ایک خواب	۱۹۷۴	۴۶۱
ہَوا اگر میرا رُوپ دھارے	۱۹۷۴	۴۶۵
دست بستہ کھڑا ہوں	۱۹۷۵	۴۶۷
دیواریں	۱۹۷۵	۴۷۰
ہَوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے	۱۹۷۶	۴۷۲
اُس کے دُشمن	۱۹۷۶	۴۷۴
انسان	۱۹۷۶	۴۷۶
سمندر اگر میرے اندر گرے	۱۹۷۷	۴۷۹
اگر ازل سے یہی چلن ہے	۱۹۷۷	۴۸۱
دُھوپ	۱۹۷۷	۴۸۳
دُعا	۱۹۷۷	۴۸۵
بیکراں وسعتوں میں تنہا	۱۹۷۸	۴۸۷
ازل سے ابد تک	۱۹۷۸	۴۹۰
نبّاض	۱۹۷۸	۴۹۳
واپسی	۱۹۷۸	۴۹۶
اک تنہا بے برگ شجر	۱۹۷۸	۴۹۸
وہ اک تازہ شے	۱۹۷۸	۵۰۰
اک سیّال سونے کا ۔ ساگر !	۱۹۷۸	۵۰۲
حادثہ	۱۹۷۸	۵۰۴
برف	۱۹۷۸	۵۰۶

نرَدبان!

"نرَدبان! ـــــ میری نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ نرَدبان، فارسی کا لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے زینہ یا سیڑھی اور اصطلاحی مفہوم ہے رفعت بام، رتبۂ بلند! بظاہر اس لفظ کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم میں مدارج کا فرق محسوس ہوتا ہے کیونکہ زینہ بہر حال بلندی تک رسائی پانے کا محض ایک ذریعہ ہے لیکن شاعری کے ضمن میں یہ دونوں مفاہیم ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں کیونکہ شاعری بیک وقت ذریعہ بھی ہے اور حاصل بھی۔ اسے ذریعہ اور حاصل میں شعوری طور پر بانٹنے کی کوشش اُن لوگوں نے کی ہے جو شاعری کو مقصدیت کے تابع کر دینے کے حق میں ہیں اور اس سے بالکل اُسی طرح کام لینا چاہتے ہیں جیسے مثلاً ایک کاریگر جو زینے کو دیوار پر قلعی کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ شاعری اگر کسی خارجی مقصد کے تابع کر دی جائے تو اس کا وہ منصب بُری طرح مجروح ہوگا جو سیاحتِ قلب کے مترادف ہے اور جس کے دوران میں خود شاعر ایک انوکھے جہانِ رنگ و بُو کو دریافت کرتا ہے۔ دریافت ہی نہیں کرتا اسے صورت بھی عطا کرتا ہے مگر غور کیجئے کہ شاعری میں دریافت کا عمل وجود میں آتا ہے اور دریافت کا عمل ہی صورت گری کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، ایک کو منہا کر دینے سے دوسرا تشنۂ تکمیل

رہ جاتا ہے۔ اپنے مجموعے کے لئے "نردبان" کو بطور عنوان منتخب کرتے وقت میرے پیشِ نظر شاعری کا یہی جوہر تھا جو بیک وقت اظہار بھی ہے اور ابلاغ بھی۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ "نردبان" کی نظمیں اس جوہر کو متشکل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں البتہ اس بات کا اظہار یقیناً مقصود ہے کہ یہ نظمیں شاعر کی ذات کو متشکل کر کے اسے پہچاننے کی کوشش ضرور ہیں۔ میں نے جب بھی کوئی نظم لکھی ہے تو اس نے مجھے اپنے "اندر" کی شکست و ریخت یا تعمیر و تشکیل کا ایک ایسا منظر دکھایا ہے جو کسی تجزیاتی عمل کی مدد سے کبھی دکھائی نہ دیتا۔ لہٰذا میں کئی بار سوچتا ہوں کہ یہ نظمیں میرے دل ساگر کے جوار بھاٹے کی ایک داستان بھی ہیں اور اگر کبھی مجھے اپنی سوانح عمری لکھنے کی ضرورت پڑی (جس کا امکان بہت کم ہے) تو میں بآسانی ان نظموں کی مدد سے اسے مرتب کر سکوں گا۔ یوں ان نظموں کا قاری ان کے قریبی مہیجات کے بارے میں بھی جان سکے گا اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات یا زمانے کی بڑی بڑی کروٹوں کی قلبِ ماہیت کا نظارہ بھی کر سکے گا جس کے نتیجے میں نظم سے لطف اندوز ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ مثلاً پچھلے دنوں جب میں بیمار پڑا اور دوائیوں اور ڈاکٹروں کی مختلف اور متنوع اقسام سے نبرد آزما ہو چکا تو میں نے سوچا کہ اپنے شہر کے مشہور معالج اور نبّاض سے رجوع کروں۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی شخصیت کا ایک گہرا تاثر میں نے فوری طور پر قبول کیا۔ ان کے بارے میں مجھے یہ علم تو ہو چکا تھا کہ وہ پچھلے کئی برس سے صرف اشاروں میں یا لکھ کر دوسروں سے ہم کلام ہوتے ہیں اور گفتگو کے وسیلے کو ترک کر چکے ہیں مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسی پُراسراری سی کیفیت میں مبتلا ہوں گے جس میں پوری شخصیت پانی میں شکر کی طرح تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں جب انہیں ملا تو ان کی زبان پر آیاتِ قرآنی کی مہک تھی۔ انہوں نے میری نبض پر اپنی انگلی رکھی اور پھر آنکھیں میچ کر انتہائی جذب کے عالم

میں چلے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کاغذ پر اپنی تشخیص کا نتیجہ لکھا اور کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پڑھا تو حیران رہ گیا کیونکہ انہوں نے میرے روگ کی سو فی صد صحیح تشخیص کر دی تھی۔

اس واقعے کے کئی روز بعد اچانک ایک صبح میرے احساسات میں ایک کہرام سا برپا ہوا اور کوئی کیفیت یا اسرار لفظوں میں منتقل ہونے کے لئے شور مچانے لگا۔ مجھے نظم کی آمد کی اطلاع ہمیشہ اس کیفیت یا اسرار نے دی ہے اور پھر نظم لفظوں میں منتقل ہو کر کاغذ پر اُترتی چلی آئی ہے۔ اس بار جب قلم نے لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے نبّاض کا سراپا اُبھرا، پھر اس عمل کی نقاب کشائی ہوئی جس کی مدد سے نبّاض نے میرے روگ کی تشخیص کی تھی۔ مگر اس کے بعد نظم کی باگ ڈور میرے ہاتھ سے نکل گئی اور جب نظم مکمل ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ اس میں میرا روگ، نبّاض کے اپنے روگ کے مقابل ایک آئینہ کی صُورت موجُود تھا۔ دونوں روگ ایک دوسرے کو کروٹ دے رہے تھے اور مجھ پر یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ روگ اُس نغمے کی طرح نہیں ہوتا جسے گراموفون ریکارڈ کی لکیروں میں قید کر لیا جاتا ہے بلکہ اُس کی حیثیت تو ایک ایسے آئینہ کی سی ہے جو صدیوں تک کسی پتھر کی طرح بے حِس اور بے عکس پڑا رہتا ہے۔ مگر جب کسی دوسرے کے روگ کو سامنے پاتا ہے تو سو رنگوں میں خود کو منعکس کرنے لگتا ہے گویا جی اُٹھتا ہے۔ نظم درج ذیل ہے:

"نبّاض"

روگ

باہر کی طرف آئے

تو چہرے پہ لکیریں اُس کی

یُوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں!
میں نے نبّاض سے پوچھا کہ مرے روگ کی صورت کیا ہے؛
(کیسا نبّاض ہے وہ — بات تو کرتا ہی نہیں
اُس کے ہونٹوں پہ مہکتی ہوئی آیات مگر
اُس کے اندر کسی شئے کا پتہ دیتی ہیں)
اُنگلیاں اُس نے مری نبض پہ رکھ دیں تو معًا
اُس کے ہونٹوں پہ مہکتی ہوئی آیات کا کہرام اُٹھا
اور چہرے کی لکیروں نے دہن کھول دیئے
اُس نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا یہ ہے!
میں نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے!
اور پھر آئینے اِک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

روگ باہر کی طرف آئے تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یوُں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
گرم شہروں کی اُدھڑتی ہوئی سڑکوں کی طرح
اور اُن کھیتوں کے مانند جو اپنے ہی پسینے میں شرابُور
مکانوں کی غلاظت میں دھنسے اُجلے مکینوں ایسے
نبض پر انگلیاں رکھے میں کھڑا ہوں کب سے

جانتا ہوں کہ اگر میں نے کسی پُرزے پہ کچھ لکھا تو وہ
اُسی کاغذ پہ اُگل دے گا وہ سب کچھ
جو مرے دُکھتے ہوئے جسم کے ہر انگ میں ہے
میرے سینے کے نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے،

روگ آواز نہیں ہے کہ اسے گہری لکیروں میں کوئی بند کرے
اور پھر نبض پہ انگلی رکھ کر
اِک گھسے نغمے کی بیٹھی ہوئی رسکار سُنے
روگ آئینے کی صورت ہے — اسے کوئی اگر
رُو برو لائے تو سو رنگ میں لَو دیتا ہے
ورنہ پتھر ہے کہ صدیوں سے پڑا ہے بے حس
زنگ اور دھُول کی چادر میں چھپائے خود کو
اپنے اندر کی غلاظت سے سجائے خود کو

تجربے کی یہ قلبِ ماہیت کسی شعوری اقدام کا ثمر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو سونے جاگنے اور ہونے نہ ہونے کا وہ عالم درکار ہے جس میں انسان منقطع بھی ہوتا ہے اور وابستہ بھی، بے نیاز بھی اور مبتلا بھی۔ وہ لاشعوری بہاؤ کی زد پر بھی ہوتا ہے اور شعور کی دہلیز پر بھی۔ فن کی تخلیق کا سارا عمل اصلاً قصّہ ہے سوتے جاگنے کا۔ اسے محض لاشعوری یا محض شعوری اقدام کہنا صحیح نہیں۔

میرا مؤقف یہ ہے کہ پس منظر سے آگاہی نظم سے لطف اندوز ہونے کے عمل کو مہمیز لگاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری تجرید کی فضا میں بالا بالا اُڑ جانے کے بجائے اپنی جملہ حسیات کی مدد سے اُس ارضی ماحول کو محسوس کرتا ہے جو نظم کا عقبی دیار بھی ہے اور اس کا منبع اور مخرج بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ قاری کو ہر نظم کے عقبی دیار کا علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود شاعر اُس کی رہنمائی نہ کرے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ خود شاعر اپنی زندگی کی کہانی کے محسوساتی رُخ کو یوں قلمبند کرے کہ اس کی ہر نظم کا سیاق و سباق ایک حد تک روشن ہو جائے یا پھر شاعر کے ساتھ شام منانے کی روایت میں یوں تبدیلی کی جائے کہ اُسے سامنے بٹھا کر اُس پر مدح اور خوشامد کے پھول برسانے کے بجائے شاعر سے صرف یہ فرمائش کی جائے کہ وہ اپنی نظمیں سُنائے اور ساتھ ساتھ ان کے عقب میں پھیلے ہوئے اپنے تجربات کے خدوخال بھی دکھاتا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خود نظم اپنے عقبی دیار اور اس کے ارضی مظاہر سے اس درجہ منسلک ہو کہ قاری کو شاعر کے تجربے میں شرکت کا موقعہ مِل سکے۔ مجید امجد کی یہی خوبی دامن کشِ دل ہے کہ وہ اشیاء اور مظاہر کے ارضی نقوش سے قاری کو آشنا کرتا ہے تاہم اُسے ان اشیاء اور مظاہر کے ہالے میں قید کرنے کے بجائے ان سے اُوپر اُٹھنے کی ترغیب بھی دیتا ہے مگر اس طور نہیں کہ نظم کا مطالعہ کرنے والا کسی ہوائی جہاز میں سوار ہو کر آسمان سے زمین پر ایک نگاہ ڈالے بلکہ یوں کہ وہ کسی ٹیلے یا پہاڑ کی چوٹی پر سے اِرد گرد کے ماحول کو دیکھے۔ مراد یہ کہ اُس کے پاؤں زمین کے ساتھ ضرور جُڑے رہیں ورنہ اُس کی مُٹھی کی گرفت سے وہ سارا عقبی دیار پھسل جائے گا جس کا لمس شاعری کی اساس اور بنیاد ہے۔

ابھی میں نے نظم کے عقبی دیار کا ذکر کیا مگر اس سلسلے میں ایک ضروری احتیاط کی طرف بھی اشارہ کر دوں۔ قصّہ یہ ہے کہ عقبی دیار سے آگاہی بیک وقت ایک مثبت قدم بھی ہے اور

منفی بھی ؛ مثبت یوں کہ قاری شاعر کے حسّی تجربے میں فی الفور شریک ہو جاتا ہے اور اس کے لئے نظم سے لطف اندوز ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ منفی یوں کہ اگر وہ خود کو محض اس واقعہ تک محدود رکھے جس کا علم شاعر کی وساطت سے اُسے ہوا ہے اور اُس معنوی پرچھائیں سے کوئی سروکار نہ رکھے جو ہر اچھی نظم کے بطن سے پھوٹتی ہے تو ظاہر ہے کہ نظم کی تہہ در تہہ کیفیات سے وہ آشنا نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا عقبی دیار سے شناسائی صرف تجربے میں شرکت کی حد تک ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد قاری خود ان جہات میں سفر کرے جو روشنی کی شعاعوں کی صورت میں نظم کی قندیل سے باہر کو لپکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو وہ نظم کے عقبی دیار کو اپنے پاؤں تلے محسوس کرنے میں کامیاب ہوگا بعینہٖ جیسے کوہ پیما پہاڑ کی چوٹی پر پاؤں رکھ کر چاروں طرف پھیلی ہوئی وادیوں کو دیکھتا ہے۔
نظم کی پرکھ کے سلسلے میں بھی اس بات کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ٹھوس تمثالیں CONCRETE IMAGES کا کیا عالم ہے کیونکہ ٹھوس تمثالیں، عقبی دیار کے ارضی نشانات ہیں جو شاعر کے حسّی تجربے کے خدوخال کو اُجاگر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا نظم ان حسّی تجربات کو بنیاد بنا کر اُوپر کی طرف اُٹھ بھی رہی ہے یا نہیں یعنی وہ محض حسّی تجربات تک محدود ہے یا معنی کی اَن گنت پرچھائیوں اور شعاعوں کو جنم بھی دے رہی ہے ؛ ہر اچھی نظم کی دو سطحیں ہوتی ہیں — ایک ارضی سطح جو ٹھوس اور محسوس تمثالوں میں متشکل ہوتی ہے۔ دوسری معنوی سطح جو امکانات کے دَر وا کر دیتی ہے۔ مگر امکانات کی صورت جبھی ممکن ہے کہ شاعر اور پھر قاری پہلے اپنے تجربے کے اندر سفر کرے اور پھر تجربے سے نکلنے والی شعاعوں پر محوِ خرام ہو۔ تجربے کے بطون میں سفر کرنے کے لئے نظم کے عقبی دیار سے آگاہی ضروری ہے اور یہ آگاہی شاعر کی وساطت سے بھی ہو سکتی ہے اور نظم کی ٹھوس تمثالوں کے ذریعے بھی۔ مؤخر الذکر طریق ایک آزمودہ نسخہ ہے مگر مقدم الذکر کو اپنی کارکردگی

کا مظاہرہ کرنے کے لئے زیادہ مواقع مہیا نہیں کئے گئے۔ کیا ہرج ہے اگر منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اس طریق کو بھی آزما لیا جائے۔

واضح رہے کہ نظم میں ٹھوس اور محسوس تمثالوں کی موجودگی خود تجربے کی موجودگی پر دال بھی ہے۔ اُردو شاعری میں ایسی نظموں کی کمی نہیں جن میں ارض کے ساتھ شاعر کا جسمانی تعلق نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک تجریدی یا نظریاتی فضا کا باسی ہے اور ارضی اشیا کو محض فاصلے سے دیکھنے پر ہی اکتفا کرتا ہے یعنی انہیں اپنے حسّی تجربے کے دائرے میں نہیں سمیٹتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نظم کا خیال تجربے کے لمس سے محروم ہو کر محض تجریدیت کا حامل ہو کر رہ جاتا ہے مشہور نیورو سرجن ڈاکٹر وائلڈر پن فیلڈ Dr WILDER PENFIELD نے انسانی دماغ کی کارکردگی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے ٹیپ ریکارڈ پر صرف انہیں اشیا، مظاہر یا واقعات کی یادیں محفوظ ہوتی ہیں جن کو انسان نے کسی نہ کسی وجہ سے اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا تھا اور وہ لاتعداد تاثرات جو انسان ہر لحظہ اپنی حسیات کے ذریعے حاصل کرتا ہے، دماغ کے شعبۂ یادداشت میں ریکارڈ نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک کوئی شے یا مظہر انسانی تجربے کا حصہ نہ بن جائے (یعنی مکمل ارتکاز سے انسان کی گرفت میں نہ آجائے) وہ دماغ کے شعبۂ یادداشت میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔ پن فیلڈ نے دوسری اہم بات یہ کہی ہے کہ واقعہ یا شے اپنے متعلقہ محسوسات سمیت دماغ میں محفوظ ہوتی ہے۔ چنانچہ جب تجربات کے دوران میں مریض کے دماغ کے اُس حصّہ کو چھیڑا گیا جس میں کوئی یادداشت محفوظ تھی تو مریض نے اِس واقعہ کو جس سے یہ یاد وابستہ تھی، اُسی طرح محسوس کیا جیسے اس نے واقعی زندگی میں اوّل اوّل اسے محسوس کیا تھا۔ گویا یاد محض تصویر کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لمس، خوشبو، آواز اور ذائقہ کے ہمراہ نمودار ہوئی۔ نیز اس کے ساتھ وہ ساری احساسی اور جذباتی فضا بھی دوبارہ سامنے آگئی جس سے اوّل اوّل مریض

گزرا تھا۔ ان تحقیقات کی روشنی میں اگر ورڈز ورتھ کے اس مؤقف کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ "شاعری نام ہے توانا محسوسات کے قدرتی بہاؤ کا۔ یہ اُن جذبات سے جنم لیتی ہے جن کی ایک حالت سکون میں بازیابی کی گئی ہو۔ مگر پھر آہستہ آہستہ سکون کی حالت باقی نہیں رہتی اور ویسے ہی توانا محسوسات پیدا ہو جاتے ہیں" تو محسوس ہو گا کہ ورڈز ورتھ کا یہ نظریہ دماغ کی کارگزگی کے بارے میں جدید ترین تحقیقات کے عین مطابق ہے اور یوں اسے ایک سائنسی بنیاد مہیا ہو گئی ہے۔ میرے خیال کو اس بات سے تقویت یوں ملتی ہے کہ جب تک نظم میں اُبھرنے والی ٹھوس اور محسوس تمثالیں تجربے کے بطن سے نہ پھوٹیں ان کی حیثیت ایک کلیشے سے مختلف نہیں ہوتی۔ لہٰذا نظم اپنی سچائی کا اوّلین ثبوت اُن ٹھوس تمثالوں سے دیتی ہے جو قاری کے ہاں بازیافت کی اُس کیفیت کو پیدا کریں جس کا ورڈز ورتھ نے ذکر کیا یعنی یاد اپنے محسوساتی دائرے سمیت وارد ہو۔ دراصل شاعری کا معرضِ وجود میں آنا اُسی طرح ہے جیسے کوئی شخص دریا کے تیز بہاؤ کی زد میں ہو اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح کنارے کی کسی چٹان، جھاڑی یا گھاس پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے خود کو دریا کے بہاؤ سے الگ کرے اور پھر دریا سے باہر آ جائے۔ شاعر بھی محسوسات کے دریا میں بہتے ہوئے ایسے ٹھوس تصورات کا طالب ہوتا ہے جو اُسے باہر نکلنے میں مدد دیں یعنی اُسے غیبت سے ہست میں لائیں اور تجرید کو تجسیم میں تبدیل کر دیں۔ تجسیم کا عمل بقائے ذات کی صورت بھی ہے کہ احساس کو جسم عطا کرتا ہے اور یوں اس کی پہچان ممکن ہو جاتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے شخص کا چٹان یا جھاڑی کو پکڑ کر دریا سے باہر آنا ایک زبردست تجربہ ہے کہ موت کے لمس سے جاگتا ہے اور شدید ارتکاز کو جنم دیتا ہے۔ اسی طرح جب شاعر کے ہاں محسوسات کے بہاؤ میں ٹھوس تمثالیں چٹان یا جھاڑی ایسا سہارا بن جاتی ہیں تو ان میں شاعر کے سارے محسوسات مرتکز دکھائی دینے لگتے ہیں یعنی محفوظ ہو

جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ احساس کے صورت پذیر ہونے کے عمل ہی میں احساس کی بقا ہے ورنہ وہ تحلیل ہو کر فنا ہو جائے گا۔ میں نے جب بھی کسی نظم کا مطالعہ کیا ہے تو اس کی ٹھوس تمثالوں کی موجودگی اور سچائی ہی کو نظم کی سچائی کا میزان گردانا ہے۔ یہ بنیادی بات ہے۔ اس کے بعد اگر نظم معنویت کی پرتیں بھی کھولتی چلی جائے تو اس نقاب کشائی کی نسبت ہی سے اس کی اہمیت متعین ہو گی۔ مگر سچی ٹھوس تمثالیں بہر حال نظم کا کچا مواد ہیں۔ بعینہٖ جیسے رنگ مصور کے لئے اور سُر موسیقار کے فنی اظہار کے لئے بنیادی عناصر کا درجہ رکھتے ہیں۔

بات بلا ضرورت پھیل رہی ہے۔ لہٰذا اس کے پر قطع کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ اگر "زرِ بان" کا قاری نظموں کی ٹھوس تمثالوں کو عقبی دیار کے خدّ و خال قرار دے کر خود بھی ان کی مدد سے عقبی دیار کو دریافت کرنے کی کوشش کرے تو وہ شاید ارضی سطح پر بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے گا اس کے بعد اگر وہ نظموں کے اُفقی دیار کی طرف بھی پیش قدمی کرے تو شاعر کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں!

وزیر آغا

وزیر کوٹ

یکم جنوری ۱۹۷۹ء

جب آنکھ کھُلی میری

سُورج کا ذرہ یکتر
چمکا — تو میں گھبرایا
ٹُوٹی ہوئی کھڑکی سے
لہراتا ہُوا نیزہ
کوندے کی طرح آیا
میں درد سے چلّایا

ہونٹوں نے پڑھے منتر
سیماب سی پوروں نے
اِک پوٹلی ابرک کی
چھڑکی میرے چہرے پر
اور کرنوں کا اک چھینٹا

مارا میری آنکھوں پر
آنکھیں مری چُندھیائیں
کُچھ بھی نہ نظر آیا

جب آنکھ کُھلی میری
دیکھا کہ ہر اِک جانب
زر تار سی کرنوں کا
اِک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پہ
مَیں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سُو
جھنکار تھی پتّوں کی
اُڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اِک ڈار سی آئی تھی
اَور مجُھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی،

میرے زرہ بکتر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
مَیں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا، اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی!

ذات کے روگ میں

تب وہ بے ساختہ رو پڑے، سینہ کوبی کرے
جانے والے کا ماتم کرے
بین کرتی پھرے
آخری بات کے سوگ میں
تلملاتی رہے
ذات کے روگ میں!

پھر وہ رُت آئے جب
چکنی، کائی زدہ سی چٹانوں پہ دیکھوں میں خود کو
مَیں آنکھوں کے پانی کو روکوں مگر پانی کیسے رُکے
تب میں چیخوں، بُلاؤں اُسے
گہرے نیلے سمندر کی تہہ میں وہ ہو گی کہیں، کون جانے!
مگر وہ بلاوے کو سُن کر، سمندر کی تہہ سے اُبھر کر
مرے پاس آئے، مجھے چھُو کے دیکھے

کہیے، تُم کہاں تھے؛
خُدارا بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کہاں تھے؛
مُجھے خود سے لپٹائے، مہکی ہوئی گود میں لے کے جھُولا جُھلائے
کوئی گیت گائے جو سیّال چاندی کا چشمہ سا بن کر بہے
دُھند بن کر اُڑے،
مُجھ کو سُورج کی چُبھتی تمازت سے محفوظ کر دے
کہے: اب تو جانے نہ دوں گی تمہیں
اب میں جانے نہ دوں گی تمہیں!

اور مَیں
اپنے بوجھل پپوٹوں کو میچے
کسی نرم جھونکے کے قدموں کی آہٹ سُنوں
تنگ ہوتے ہوئے دُودھیا بازوؤں کے
ملائم سے حلقے میں سونے لگوں
کاش سونے لگوں
کاش میں سو سکوں!

آنکھ بھنوّر کی

سوچ اگر اِک ندّی ہوتی
دھرتی کے سینے پر بہتی
یا اِک اُڑتا پنچھی بن کر
مُجھ سے کہتی:
تُم کِن اُلجھے دھاگوں میں محبوس ہوئے ہو
کیوں اتنے مایوس ہوئے ہو؟

لہریں رقص کریں تو کیا ہے!
آگے بڑھ کر لوٹ آئیں گی
اپنے جیسی لاکھوں لہروں سے ٹکرا کر
جھاگ اُگلتا، چکراتا سا، ایک بھنور بن جائیں گی

اور ہوائیں

دِل دہلا کر، چھتیں اُڑا کر، پیڑ گرا کر
کون سے دیس کو جائیں گی
جلد ہی لوٹ کے آجائیں گی
جیسے کوئی بڑا ضروری کام ادھورا پڑا ہوا ہو!

سوچ کی لہریں — اندھی، قاتل!
اور ہوائیں
نشّے کی حالت میں — گھائل!
مَیں، اِک نُقطہ
مَیں وہ کھُلی ہوئی سی آنکھ کہ جس میں
ایک خَلا ہے
جس کے چاروں جانب اِک کہرام بپا ہے!!

بجھی راکھ کا انگ

کہا تُو نے : اے خستہ تن !
آگ نے مُجھ کو کُندن بنایا
تُجھے اِک لرزتا بکھرتا ہوا سرمئی سا بدن
ہے یہ کیسا مِلن ؟

کہا میں نے : اے روشنی کی کرن !
تُو میرے لئے بھی خیاباں
ہیں تیرے لئے مہرِ تاباں
تُو چاندی سے کُندن بنی
ایک سیّال سی دھات سے
دُوسری میں ڈھلی
قید پھر بھی رہی
اور میں

خشک لکڑی کا بَن

جب جلا، راکھ میں ڈھل گیا
کچھ سے کچھ ہو گیا

تیری فطرت، فقط رنگ سے رنگ تک
میری قسمت
بجھی راکھ کے انگ تک

تُو ازل سے ابد تک جواں
مَیں اندھیرے کی بجھتی رسلوں میں
فقط ایک پل کی چمکتی ہوئی داستاں!

کہا تُونے ـــ اے خستہ تن!!

سلومی

بانکی بھینی، نازک خوشبو
شعلہ بن کر اُتری
شبنم بن کر بکھری
نُورانی پیکر میں ڈھلی اور گھُوم گئی
نشّہ بن کر جھُوم گئی
آنکھ لجا کر، جسم چُرا کر
رقص کیا
گات دکھا کر، ہاتھ گھُما کر چھب دکھلا کر
رقص کیا
اپنی ہی جھنکار میں یکسر ڈوب گئی!

بین بجی
تو کالی، رینگتی سازش بن کر

اپنے ہی مکھڑے کے بھاری پردے سے
باہر کو لپکی
خنجر بن کر چمکی
گردن کی شہ رگ میں اُتری
چلّو بھر کر خون پیا
اپنی ہی پھنکار میں یکسر ڈوب گئی!

بوجھل سی اِک سرگوشی نے پنکھ لپیٹے
ٹوٹے پھوٹے لفظ سمیٹے:
"تم بھی؟ — لو اب تم بھی؟"
حیرت — آنکھوں کے مرمر پر جیسے نقش ہوئی ہے
طشت میں اپنا سر رکھے وہ ناچ رہی ہے!

سفر کا دوسرا مرحلہ

چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا
کب گری ریت کی وہ ردا
جس میں چھپتے ہوئے تُو نے مجھ سے کہا:
آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا
مُڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟
کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا — کچھ نہیں اب
اسے گلتے کے تنہا محافظ! ترا اب محافظ خُدا!

میرے ہونٹوں پہ کف
میرے رعشہ زدہ بازوؤں سے لٹکتی ہوئی گوشت کی دھجیاں
اور لاکھوں برس کا بڑھاپا

جو مجھ میں سما کر مہکنے لگا

مجھ کو ماضی سے کٹنے کا کچھ ڈر نہیں
اپنے ہم زاد کو رُوبرو پا کے میں غم زدہ بھی نہیں
یہ عصا، جھکتے شانوں پہ کالی عبا اور گلتے کے چلنے کی پیہم صدا،
اب یہی میری قسمت، یہی آسرا!!

کہانی

عجب دن تھے وہ
جھاڑیاں، آک کے جُھنڈ، کائی زدہ تال
جن کے کنارے ہزاروں برس سے کھڑے
جنڈ اور ون کے ڈھانچے
پُھلائی کے پھر واں کے جنگل جو دھرتی پہ بچھ سے گئے تھے
اُداسی ہوا بن کے پھرتی تھی
اور سنت سادھو
پُرانے درختوں کے نیچے بچھی گھاس پر
آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے
خود اپنے ہی اندر کے تاریک جنگل کا حصّہ بنے تھے

عجب دن تھے وہ
جب بھی کچھ کہنا چاہا
گھِسے، مُردہ لفظوں کی کوئی گمک تک نہ آئی

چراُئی تو پھر ہونٹ ہل سے گئے
اور آنکھیں
نہ کہہ سکنے کے کرب میں مُبتلا ہو کے
اپنے ہی حلقوں سے باہر نکل آئیں، رِسنے لگیں
اور پھر ایک دِن
اونچے نیچے پہاڑوں سے ہوتا ہُوا وہ
یہاں آکے ٹھہرا
یہاں آکے اُس نے
معمر ترین وَن کے نیچے وہ شعلہ جگایا
کہ جس میں بھسم ہو گئے سب — یہ وَن، جنڈ، پھرواں، پھلاَئی
ہُوا ہو گئے، سنت سادھو، کٹی جھاڑیاں
اور کائی زدہ تال — دھرتی کے ناسُور
اب ان کا نام و نشاں بھی نہیں تھا
تب اُس نے
مقدس عصا سے وہ جادُو جگایا کہ ساری فضا سَیلِ انوار میں بہہ گئی
گھونسلوں اور پھُولوں میں ڈھلتی گئی یہ زمیں
یہ چہچہوں، خوشبوؤں سے ہَوا اَٹ گئی!!

آج وہ لوٹ کر جا چُکا ہے

تو پھر کالی دھرتی کے اندر سے اُگ آئے ہیں
جنڈ کے پیڑ، کانٹوں بھری جھاڑیاں
پھر سے رسنے لگے ہیں
وہ کائی زدہ تال
جن کے اندر سے
منحوس سادھو نکل کر کناروں پہ بیٹھے ہوئے ہیں
اُداسی ہوا بن کے پھرنے لگی ہے
کسی نے الاؤ پہ بھاری قدم کیا رکھا ہے
اندھیرے کا بوجھل سا پٹ کھل گیا ہے
فضا بجھ گئی ہے!

فضا بجھ گئی ہے
مگر کور آنکھوں کو کیسے دکھاؤں
کہ اُس بھاری پاؤں کے نیچے
اندھیرے کے بوجھل سے اُس پٹ کے پیچھے
کرن، اپنے بستر پہ لیٹی ہوئی ہے
سنہری سے اِک بیج میں سو رہی ہے!

ہوا کہتی رہی آؤ —

ہوا کہتی رہی آؤ
چلو اُس شاخ کو چھُو لیں
اِدھر، اُس پیڑ کے پتّوں میں چھُپ کر تالیاں پیٹیں
گریں، اُٹھیں، لُڑھک کر نہر میں اُتریں، نہائیں
مخملیں سبزے پہ ننگے پاؤں چل کر دُور تک جائیں!

ہوا کہتی رہی آؤ
مگر میں خشک چھاگل اپنے دانتوں میں دبائے
پیاس کی برہم سپہ سے لڑ رہا تھا، میں کہاں جاتا
مجھے سُورج کے رتھ سے آتشیں تیروں کا آنا
اور چھاگل سے ٹھمک کر آب کا گرنا
کسی بچے کا رونا اور پانی مانگنا بھُولا نہیں تھا، میں کہاں جاتا
مَیں اپنے ہاتھ کی اُبھری رگوں میں قید
اپنی آنکھ کی تپتی ہوئی خاکِ سیہ میں جذب تھا یکسر

مجھے اِک جُرعۂ آبِ صَفا درکار تھا — اور میرے بچّے نے
صدا دی تھی مجھے، آؤ، خدا را اب تو آجاؤ
کہ میرے ہونٹ اب پھٹ بھی چُکے
آنکھوں کا امرت سُوکھ کر بادل بنا، اُڑ بھی گیا!

ہوا کہتی رہی آؤ
یہ بندھن توڑ دو پیارے
مگر میں ہاتھ کی اُبھری رگوں میں قید
اپنی آنکھ کی تپتی ہوئی خاکِ سیہ میں جذب — کیا کرتا!
کہاں جاتا!!

اشومیدھ یگیہ!

گوری چِٹّی یال — گھنی سی
دُودھ ایسی پوشاک بدن کی
لانبے نازک ماتھے پر مہندی کا گھاؤ
اُڑتی، گرتی خاک سُموں کی
مُٹھی بھر کر، مُنہ پر مَل کر، دل کی پیاس بُجھاؤ
صدیوں کے دُکھ جھیلتے جاؤ

رہے سفر میں
ہرے مہکتے کھیتوں میں خوش باش پھرے
اپنے پیچھے آتی قوّت کے نشّے میں کھویا
رستے کے ہر بھاری پتھّر کو ٹھوکر سے توڑے
آگے ہی آگے کو دوڑے

آج یہاں تک آ پہنچا ہے
پر وہ کل اب دُور نہیں ہے
جب اس کے قدموں کے بھالے
قریہ، قصبہ، شہر، سبھی کو
پل بھر میں مسمار کریں گے
ہر شے کو تاراج کریں گے
اِس مرقد سے
اُس مرقد تک
راج کریں گے!

اور پھر وہ دِن بھی آئے گا
جب اِک تیز، سنہرا نشتر
شہ رگ میں اُس کی، اترے گا
خُون کا فوارہ چھُوٹے گا
اور وہ قوت
رینگتی اور پھنکارتی قوت
موج میں آ کر ناچ اُٹھے گی
خوشی سے پاگل ہو جائے گی!!

بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں

چلو ہم بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں
زمیں پر اُترتی ہوئی برف کے سرد بوسوں سے خود کو بچائیں
نگاہوں میں وحشت، زباں پر کڑکتے ہوئے بول لائیں
گھنے دم بدم جلتے بُجھتے ہوئے بادلوں سے گزر کر
ستاروں کے جُھرمٹ کو ہاتھوں کی پوروں سے دو نیم کر کے بڑھیں
برف کے اک تڑختے پگھلتے جہنّم میں اُتریں
سیاہی کے یخ بستہ مرقد پہ آنسو بہائیں!

چٹانیں اگر کہنہ صدیوں کی گاڑھی، گھنی، گیلی بدبو میں
لتھڑی پڑی ہیں تو کیا ہے!
اگر گھاس کی لاش کو برف کی ایک میلی رضائی نے
آنگن کو مُردہ درختوں کی بھُوبل نے ڈھانپا ہوا ہے تو کیا ہے!
کہ ہم راکھ کے ڈھیر
گرتی ہوئی برف کے بھلبھے نرم گالے

کسیلی سی بدبُو کے بھبکے نہیں ہیں
تجھے کیا خبر ہم
زمیں کی طرح بھُوری مٹی کی اِک کھال اوڑھے ہوئے ہیں
اگر ہاتھ ہم کو میسر نہیں ہیں تو کیا ہے!
چلو اپنی پلکوں کے نیزوں سے اس بھُوری مٹّی کی تہہ کو ہٹائیں
چلو تیز شعلوں کے دوزخ میں اُتریں
اُبلتے ہوئے تُند لاوے کی موجوں میں دھُونی رمائیں!!

سُورج کے آنے سے پہلے

بادل اوڑھ کے آجاؤں
برکھا بن کر برس پڑوں
سیپ میں اُتروں
گھاس پہ بکھروں
پھُول کے مکھ پر چمک اُٹھوں
پَر تولوں
اُڑتے اُڑتے
دُودھیا کُونجوں کے دھلے گے ہیں
موتی بن کر دمک اُٹھوں
تھک جاؤں

آنسو کی اِک بوُند میں ڈھل کر
پلکوں سے آکاش کی، ٹپکوں
اِک جلتا انگارہ بن کر
مہندی والے ہاتھ پہ تیرے آن گروں
سوُرج کے آنے سے پہلے
وحشی سا اِک رقص کروں!!

آویزش

آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی
باغ کے مغربی گوشے میں جُھکے نیم کے چھتنار تلے
ایک بادرنگ سی چادر پہ وہ بیٹھا تھا مجھے دیکھ کے سرشار ہُوا:
"بھائی کیسے ہو! نظر تم کبھی آتے ہی نہیں
آؤ کُچھ دیر مرے پاس تو بیٹھو، دیکھو!
کیسا چُپ چاپ ہے یہ باغ کا گوشہ جیسے
کسی مَوّاج سمندر میں جزیرہ کوئی
دُور وہ سُرمئی بادل کی فروزاں جھالر
جیسے، ہاں جیسے — مگر خیر کوئی بات نہیں
آؤ، تُم پاس تو بیٹھو میرے!

اور میں بیٹھ گیا
اُس کے ہونٹوں سے اُترتے ہوئے الفاظ کی چہکار میں تادیر میں خاموش رہا
کیسی چہکار تھی وہ — خشک پیڑوں میں ہوا کا نوحہ

جیسے گرتے ہوئے پتّوں کی لگاتار صدا !

دفعتاً سوچ کے اِک اجنبی جھونکے نے مجھے چھیڑ دیا :
جانے کب سے یہ مسافر ہے جزیرے میں مقیّد، تنہا
منتظر، آئے گی اک روز کہیں سے ناؤ
بادباں ابر کا، چاندی کے چمکتے چپّو
رسمساتی ہوئی اِک نرم رسیلی آواز :
تُو کہاں ہے ؟ تُو کہاں ہے کہ تجھے
ڈھونڈتے ڈھونڈتے، میں ہار گئی ہار گئی !!

اور بدرنگ سی چادر پہ وہ بیٹھا ہوا شخص
خواب میں بولتا جاتا تھا، سیہ باسی لفظ
اُس کے سُوکھے ہوئے ہونٹوں سے نکل کر ہر سُو
جُھوٹے سکّوں کا بناتے چلے جاتے تھے حصار !

آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی
وہیں، اُس باغ کے گوشے میں، جُھکے نیم کے چھتنار تلے
آج پھر اُس سے ملاقات ہوئی !!

ٹین کا ڈبہ

سمندر کے بوسوں سے ہاری ہوئی ریت —
ریت پر ٹوٹی پھوٹی، پرانی، سیہ رنگ چیزوں کے انبار میں
ایک پچکا ہوا ٹین کا زرد ڈبہ
سیاہی کے برہم سمندر نے جس کو اُچھالا
سیاہی کے بے نام ساحل نے جس کو سنبھالا
اندھیرے میں بکھرے ہوئے مُردہ لمحوں کے اِک ڈھیر میں
پا شکستہ سی اک ساعتِ نیم جاں
کالے قرنوں کے سفرِ مسلسل کی اِک داستاں!

کالے قرنوں کی وہ داستاں
تیرگی کی چٹانوں سے ٹکرائی
ٹکرا کے روشن ہوئی
گھُپ اندھیرے میں اُبھریں — لکیریں!
لکیروں سے بنتی گئیں صُورتیں

پیڑ، بادل، مکاں، ایک روشن ندی
اور روشن ندی کے کنارے، چمکتی ہوئی گھاس پر
دُودھیا اُون کی دھجّیاں
روشنی کا ابھرتا ہوا اک جہاں!

تیرگی اب کہاں ہے؟
تڑپتی ہوئی ریت پر ہر طرف
شوخ کرنوں کا اک جال سا تن گیا ہے
چمکتا ہوا ٹین کا زرد ڈبہ
شعاعوں کا لاوا اُگلنے لگا ہے
اُبلتے ہوئے روشنی کے سمندر میں ڈھل کر
زمیں سے فلک تک اُچھلنے لگا ہے!!

ناموجود کے بھاری دَر پر

آنکھیں کور اور چہرہ شَل
ہونٹوں کے دروازے بند
پیشانی — مرمر کی سِل
سِل پر لکھی ایک عبارت:

یہ وہ عالی شان عمارت
شپرک جس کے باسی
بیلیں جس کی پیاسی!

مَیں بیلوں کے کُنبے کا اِکلوتا وارث
اپنے تن کی کہنہ عمارت سے چمٹا ہوں
لانبے، پتلے، سانپوں ایسے ہاتھوں سے مَیں
دیواروں پر رینگ رہا ہوں

دروازوں سے لپٹ رہا ہوں
تاریکی کے بے آواز سمندر کو چھُوتا ہوں
نامعلوم کے پردوں تک بڑھ جاتا ہوں
پھر کچھ آگے
ناموجود کے بھاری دَر سے ٹکراتا ہوں

میں بیاباں کے کُنبے کا اِکلوتا وارث
آنکھوں سے محروم سراسر
لانبے، پتلے، سانپوں ایسے ہاتھوں سے میں
بھاری بھرکم دروازے پر
دستک دیتے دیتے ہار گیا ہُوں
کب اپنی دہلیز سے لیکن پار گیا ہُوں؟

نشرگاہ

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
یہ نہ سوچا
کہاں سے چلا تھا، کہاں آکے ٹھہرا
مَیں کس منزلِ بے نشاں کی طرف اب رواں ہوں؟
مجھے خشک، بدرنگ چمڑے پہ لکھے سوالوں سے رغبت نہیں تھی
مَیں منطق کی ورزش سے خود کو تھکانا نہیں چاہتا تھا

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور دیکھا
فلک کی سیہ، گہری، سُوکھی ہوئی باولی سے
کروڑوں ستارے
شعاعوں کی بے سمت، بے لفظ، گونگی زباں میں
لرزتے لبوں سے
"نہ ہونے" کے منکر تھے
ہونے کا اعلان کرتے چلے جا رہے تھے!

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بیتاب پھولوں سے، ساون کے جھولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی:
مجھے اپنے "ہونے" کا حق الیقیں ہے
میں اعلان کرتی ہوں اپنا!

عجب سلسلہ تھا
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم
صداؤں کی، لہروں کی اک چیختی نشر گہہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا

یہ اعلان کس کے لئے تھا؟
تخاطب کا رُخ کون سی سمت میں تھا؟؟
تجھے کیا خبر ہے!
تُو اس نشر گہہ کا فقط ایک ادنیٰ ملازم
تُو کچھ بھی نہیں جانتا ہے!!

دُکھ میلے آکاش کا

دُکھ کے رُوپ ہزاروں ہیں
ہَوا بھی دُکھ اور آگ بھی دُکھ ہے
مَیں تیرا تُو میرا دُکھ ہے
پَر یہ میلے اور گہرے آکاش کا دُکھ
جو قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے
اس دُکھ کا کوئی انت نہیں ہے!

جب آکاش کا دِل دُکھتا ہے
بچّے بوڑھے، شجر حجر، چڑیاں اور کیڑے
سب کے اندر دُکھ اُگتا ہے
پھر یہ دُکھ آنکھوں کے رستے
گالوں پر بہنے لگتا ہے

پھر ٹھوڑی کے پنچ ند پر سب دھارے آ کر مل جاتے ہیں
اور شبنم سا مکھ دھرتی کا
خود اک دھارا بن جاتا ہے

سنا یہی ہے
پہلے بھی اک بار دکھی آکاش کی آنکھیں ٹپک پڑی تھیں
پر دھرتی کی آخری ناؤ
زیست کی بکھری قاشوں کو چھاتی سے لگائے
پانی کی سرکش موجوں پر ناچ دکھاتی
دور افق تک جا پہنچی تھی!

آج مگر وہ ناؤ کون سے دیس گئی ہے
دکھ — میلے آکاش کا دکھ
اب چاروں جانب امڈ پڑا ہے
قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے!

اِک نقش پیارا

سمندر سے مشکیزہ بھر کر وہ بادل پُکارا :

کہاں ہیں پہاڑوں کی سوکھی چٹانیں
درختوں کے اکڑے ہوئے خشک ڈھانچے
تڑختی ہوئی شور کھیتوں کی مٹی ؛
کہاں ہے وہ آنکھوں کی وحشت
لبوں پر لرزتی ہوئی پیاس کی لَو
دِلوں کی تجوری میں نفرت کی "دولت" ؛
کہاں ہے
نحوست کے بے نُور ہالے میں جکڑا ہُوا
خوش نصیبی کا تارا ؛

سمندر سے مشکیزہ بھر کر وہ بادل پُکارا

تو انگڑائی لے کر فضا گنگنائی

ہوا سبز فرغل میں لہراتی آئی

فلک سے زمیں پر جُھکا حُسن سارا

زمیں کے شگافوں سے نِکلے مصوّر

حسیں مُوقلم، شوخ رنگوں کا دھارا

معًا کھُردری، خُشک دھرتی کے چہرے پہ بننے لگا

آنے والے زمانوں کا اِک نقش پیارا

وہ اِک خواب جس کو چمکتے ستاروں،

دہکتے ہوئے تیز رنگوں کا فرغل دلانے کی کوشش میں

ہم تُم نے عُمریں بِتائیں

زمانہ گُزارا!!

آمد

کبھی خشک موسم میں پُروا جو چلتی
تو بنجر پہاڑوں، گھنے گرد آلود شہروں سے کترا کے
ہم تک پہنچتی
ہمیں تند یادوں کے گرداب میں
ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے دیکھ کر ہم سے کہتی:
میں اُن سب کے جسموں سے مَس ہو کے آئی ہوں
اُن کے پسینے کی خوشبو کو
اپنے لبادے میں بھر کر
ہتھیلی پہ رکھ کر میں لائی ہُوں!

کبھی سُرخ سُورج نکلتا
تو ہم اُس سے کہتے:

تمہاری دہکتی ہوئی آنکھ کا راز کیا ہے؟
وہ کہتا:
میں اُن سب کی آنکھوں کے غُرفوں سے
یہ ساری اُجلی تمازت چُرا تا رہا ہوں
میں دریوزہ گر اُن چراغوں سے خود کو جلا تا رہا ہوں!

اُنہیں ہم نے ڈھونڈا
کبھی سبز شبنم کے چھینٹوں میں، تاروں کی روتی ہوئی انجمن میں
کبھی صُبح کی قتل گاہ، شب کے گھائل بدن میں
اُنہیں ہم نے آواز دی کُو بکُو
غم میں ڈوبی ہوئی بستیوں سے اُٹھے خاکدانِ وطن میں
مگر وہ نہیں تھے، کہیں بھی نہیں تھے
کہیں اُن کے قدموں کی ہلکی سی آواز تک بھی نہیں تھی!

پھر اک روز دھرتی کا موسم جو بدلا
تو بادل نے شانوں سے ہم کو ہلا کر جگایا
کہا: اُن کے آنے کا پیغام آیا
چہکتے پرندوں نے شاخوں سے اُڑ کر
ہواؤں میں اک دائرہ سا بنایا

کہا: اُن کے آنے کا پیغام آیا
دھنک۔ سات رنگوں میں لپٹی ہوئی
اِک کماں بن کے ظاہر ہوئی
ہم سے کہنے لگی: اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے انہیں
تیز قدموں سے آتے ہوئے!
شام ہنسنے لگی
اُس کی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو تھے
عارض پہ شبنم
نگینوں کی صُورت چمکنے لگی تھی!!

سیلِ بلا

جو سوچو

تو قرنوں کی اِس رہگزر پر

یونہی ایک نٹ کھٹ سا لمحہ رُکا

اپنے ٹوٹے ہوئے بُوٹ کی نوک سے

مُجھ کو ٹھوکر لگا کر

سڑک پر بچھی سُرخ بجری پہ مجھ کو گِرا کر

پھر اِک بار

اِک تُند خو، سر پھرے، تیز جھونکے کی صورت رواں ہو ُا!

جو دیکھو

تو اِس ایک ٹھوکر سے میں
رہگزر کے سیہ رنگ کتبے پہ لکھا گیا
نقشِ پا تھا کبھی
نقشِ جاں ہو گیا
جاوداں ہو گیا!!

عجیب ہے یہ سلسلہ!

عجیب ہے یہ سلسلہ
یہ سلسلہ عجیب ہے
ہَوا چلے — تو کھیتیوں میں دُھوم چہچہوں کی ہے
ہَوا رُکے — تو مُردنی ہے
مُردنی کی راکھ کا نزول ہے
کہاں ہے تُو — کہاں ہے تُو؟
کہاں نہیں ہے تُو — بتا!
ابھی تھا تیرے گرتے اڑتے آنچلوں کا سلسلہ
اور اب اُفق پہ دُور تک
گئے دنوں کی دھُول ہے
گئے دنوں کی دھُول کا یہ سلسلہ فضول ہے!

مَیں رو سکوں
تو کیا یہ گدلی کائنات دُھل سکے گی
میرے آنسوؤں کے جھاگ سے ؛
مَیں مُسکرا سکوں
تو کیا سفر کی خستگی کو بھول کر یہ کاروانِ نجوم کے
برس پڑیں گے موتیے کے پھُول بن کے
اس مہیب کاسۂ حیات میں ؛

نہ تُو سُنے، نہ میں کہوں
نہ میرے انگ انگ سے صدا اُٹھے
یُوں ہی — میں آنسوؤں کو، قہقہوں کو
اپنے دل میں دفن کر کے
گُم
لبوں پہ سِل دھرے
ترے نگر میں پاپیادہ، پا برہنہ
شام کے فشار تک رواں رہوں
مگر کبھی
تری نظر کے آستاں کو
پار تک نہ کر سکوں

کہ تُو ازل سے تا ابد
ہزار، صد ہزار آنکھ والے وقت
کی نقیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے !!

ایک خواب

دُھندلکوں کے باریک دھاگوں میں لپٹی ہوئی
مطمئن، بے خبر
میں نے دیکھا — وہ مجھ پر جُھکی تھی
وہ چشمِ حسیں جس کے ہر انگ میں مامتا تھی
مجھے یوں لگا تھا وہ چشمِ حسیں تو مجھے
بس مجھے گھُورتی ہے
کسی اور کو دیکھنے کی اُسے نہ تو فُرصت
نہ ہمّت، نہ خواہش
فقط مرکزِ ہست کو دیکھتی ہے
مجھے دیکھتی ہے!

مَیں اُس آنکھ کی جھیل میں تیرتے سبز بجرے
کی درزوں سے رِستے ہوئے گرم سیّال سونے کی بوندوں

کے پیچھے لپکتا رہا — جگنوؤں سے مجھے اُن دنوں کیسی رغبت تھی!

میں — جلتے بجھتے ہوئے پیکروں کو پکڑ کر
انہیں اپنے تن پر سجانے کی خواہش میں
کس درجہ بے بس ہوا تھا
کہ میں خود بھی شاید
چمکتے ہوئے جگنوؤں کے سمندر میں
اک جلتا بجھتا سا جگنو تھا
اپنے ہی ہم زاد کو ڈھونڈتا تھا!

زمانہ — وہ مکتب سے بھاگا ہوا وحشی لڑکا
جو میرے تعاقب میں گر گر کے پاگل ہوا تھا
اُسے دُھن اگر تھی تو بس اس قدر تھی
کہ وہ اپنی مٹھی میں مجھ کو گرفتار کر کے دکھائے

زمان و مکاں کی حدوں میں
کسی صاف تختی کے چہرے پہ لکھے
سیاہی کے بے نام نقطے پہ رُکنے کا خوگر بنائے

مگر میں تو اُس آنکھ کے آبِ گم کا شناور
زمانے کی مٹھی میں آنے سے بیزار تھا

جانتا تھا کہ ظالم زمانہ تو وحشی پرندے کی صورت
گرسنہ نگاہوں کے عزفوں سے مجھ کو ہمیشہ تکے گا
میں اس بات سے آشنا تھا
کہ میں گر رُکا
تو مجھے آنکھ سے گرم آنسو کی صورت ٹپکنا پڑے گا
کسی سبز موتی کی ٹھنڈی لحد میں اُترنا پڑے گا

پھر اِک روز
وحشی پرندے کی پہلی جھپٹ مجھ پہ نازل ہوئی
آنکھ رونے لگی
اور میں زخم کو چاٹتا
جھیل کے پانیوں میں سسکتا پھرا
آنکھ روتی رہی
ہر جھپٹ پر وہ آنسو کے قطروں میں ڈھل کر
کناروں سے باہر نکل کر، بکھرتی رہی
اور پھر — ایک دِن
جھیل پانی کے امرت سے خالی ہوئی
جلنے بُجھنے کے عالم سے آزاد ہو کر
زمان و مکاں کی حدوں میں

کسی صاف تختی کے چہرے پہ دھبّہ بنی

اور میں

نیلے آکاش پر چھنتے اور ہنستے ہوئے اُس پرندے

کی آنکھوں میں اپنی ہی تصویر کو دیکھ کر مسکرایا

سیاہی کے جادو سے باہر نکل کر میں اپنے ہی عرفان سے جگمگایا

زمانہ مجھے دیکھ کر مجھ پہ جھپٹا

مگر میں تو اک جھیل تھا، میرے اندر زمانوں کے بجرے تھے

بجروں سے سیّال سونے کی کرنیں نکلنے لگی تھیں

زمانہ مجھے اپنے پنجے میں لینے کو جھپٹا مگر ایک پل میں

وہ خود میری مُٹھّی میں محبوس تھا

ایک جگنو۔ جسے میں نے ماتھے پہ قشقہ بنا کر لگایا

جسے میں نے موتی کی ٹھنڈی لحد میں اُتارا

جسے میں نے ٹھنڈی لحد کے کنارے کا کتبہ بنایا!!

ہَوا اگر میرا رُوپ دھارے!

ہَوا کچھ رُکے لگاکے کہتی ہے: تُم ابھی سانس لے رہے ہو؟
ہَوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ سانس تو ایک واہمہ ہے
ہزاروں کالی نحیف جونکیں
مرے بدن سے چمٹ گئی ہیں
بدن کے ساغر کو پی رہی ہیں
مَیں خشک ہوتے ہوئے شجر کا سفید پتّہ
ہَوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ تھرتھراہٹ
خود اُس کے ہاتھوں کی کپکپی ہے
مری شکستہ اُڑان
اُس کی دہکتی پھونکوں کی قوس تک ہے
میں اِک لرزتا سا واہمہ ہوں
مہیب، کھڈ کے لبوں پہ اٹکا ہَوائیں چکنا سا گول پتّھر
ہَوا کی ٹھوکر کے خوف میں مُبتلا کھڑا ہوں!

ہَوا سے کیسے کہوں کہ میں اِک جری سپاہی
مَیں اپنے خنجر کی نوک سے خود ہی کٹ گیا ہوں
لہُو کے قطروں میں بٹ گیا ہوں

ہَوا اگر خوشبوؤں کا فرغل پہن کے آئے
ہَوا اگر بادلوں سے جھانکے
ہَوا کہے گر کہ وہ تو اِک لمس ہے ذرا سا
ہَوا اگر میرا رُوپ دھارے
مُجھے پُکارے
تو ہنس پڑوں میں
ہَوا کے قدموں کی دھُول بن کر
برس پڑوں مَیں

دست بستہ کھڑا ہوں!

ہَوا — ایک نابینا لڑکی ہے
آنکھوں کے جنگل میں ہاتھوں سے رستہ بناتے ہوئے چل رہی ہے
کوئی اس کے کشکول میں کوئی سِکّہ گرائے
جلی خشک روٹی کا ٹکڑا اُسے دان دے تو — ہَوا
اپنے محسن کو میٹھی سی کومل دُعا دے کے آگے کو بڑھتی ہے
گہرے دُھندلکوں میں لپٹی ہوئی منزلِ بے نشاں کی طرف
آسماں کی طرف

اَزل سے مَیں اس اندھی لڑکی کے پیچھے
زمیں پر گرے بھیک کے خشک ٹکڑوں پہ پلتا رہا ہوں
کسی منزلِ بے نشاں کی طرف سُست قدموں سے چلتا رہا ہوں
مگر اب مجھے اس سفر سے
چمکتی ہوئی سُرخ راکھی کے بندھن سے

اندھی ہوا کے چلن سے
کسی سے بھی رغبت نہیں ہے!

چلو
(خود سے کہتا ہوں)
اس اندھی لڑکی کا اب ساتھ چھوڑیں
شب و روز کے دائرے سے نکل کر
ذرا اپنی جانب بھی رُخ اپنا موڑیں!

میں اپنی طرف مڑ گیا ہوں
مگر دیکھتا ہوں
مَیں تو خود اپنے رستے میں اک سبز جنگل کی صورت کھڑا ہوں
ہزاروں تنوں، اَنگنت شاخساروں، کروڑوں گھنی جھاڑیوں سے اَٹا ہوں
مَیں اُن ساری پگڈنڈیوں کو
جو میری طرف بے تحاشا اُمنڈنے لگی تھیں
خنک بے نیازی سے ٹھکرا رہا ہوں!

مَیں اب تیرہ جنگل کی ٹیڑھی سیہ اُنگلیوں
سانپ ایسی مُڑی ٹہنیوں میں اُترنے لگا ہوں
اندھیرے کی دُنیا میں مشعل کی صورت بڑھا ہوں

تراشیدہ رستے تو جنگل کے باہر کہیں رہ گئے ہیں
گھنے، تیرہ، جنگل کے اندر میں خود اپنا رستہ بنا ہوں!

عجب روشنی ہے
اندھیرے کے کشکول میں کس نے سونے کا دینار پھینکا
کہ کلیاں شعاعوں کی کھلنے لگیں
سارے جنگل کے پتے زمرد بنے، ٹہنیاں پیلے سونے کی چھڑیاں ہوئیں
جھاڑیوں میں دہکنے لگے سرخ پھولوں کے فانوس
سات رنگوں کی پریاں انوکھا سا اک رقص کرنے لگیں
اور پھر میں نے دیکھا
کہ میں اپنے ہی روبرو دست بستہ کھڑا ہوں
میں تاریک جنگل خود اپنے ہی پرتو سے اندھا ہوا ہوں!

دیواریں!

صدیوں گُنگ رہیں دیواریں

اور پھر اِک شب جانے کیسے
دیواروں پر لفظوں کے انگارے چمکے
انگاروں نے مِل جُل کر شعلے بھڑکائے
سارے شہر میں آگ لگی
کاغذ کے ملبوس جلے
کالے ننگے جسموں سے بازار بھرے
آوازوں کے جھکڑ آئے — بادل چیخا
آنگن کے بے داغ بدن پر
جلی ہوئی ہڈّیوں کے اولے
پتھّر بن کر برس پڑے

اگلے دن جب اُجلی دھوپ پگھلنے آئی
سب نے دیکھا
دیواروں کے لب نیلے تھے
سب ننگی تھیں
گھٹتے بڑھتے سایوں کی گونگی بھاشا میں
بول رہی تھیں!!

ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے!

سُلگتی شب کا عجیب سماں تھا
فلک تھا پیتل کا تھال جس میں
چمکتا، کانسی کا چندرماں تھا
دیئے کے مانند ضَو فشاں تھا
درخت چُپ تھے کہ جس طرح پابجولاں مُجرم
مکاں کی چھت کا اِک ایک شہتیر
زمیں کے مرقد کا پاسباں تھا
تھا تنگ گلیوں میں گرم اینٹوں کا فرش جس پر
رُکا ہُوا بے لباس جسموں کا کارواں تھا
میں اس قدر تھک چُکا ہوں۔ مجھ کو
کبھی نہ اس بات کا گُماں تھا
سُلگ رہی تھی زمین ساری
تمام عالم دھواں دھواں تھا!

سحر سے پہلے

نجانے کیسے کسی نے قفلِ جمود توڑا
ہَوا کے جھونکے کو بند پنجرے سے دی رہائی
فضا میں چھوڑا
ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے
بدن کو تولا
چہک اُٹھے شاخ شاخ پتّے
چمکتا، کانسی کا چاند۔ بولا!
پَروں کا اُجلا سا لمس
میرے بدن پر اُترا تو میں بھی زندوں کی
صَف میں آیا
مگر وہ جھونکا تو اک پرندہ تھا
اُڑ گیا شب کے راستوں پر
کبھی نہ پھر لوَٹ کر وہ آیا!

اگر مری ذات ایک زنداں ہے
جس کے دَر سے نکل کے تُم پھر
کھُلی فضاؤں میں پَر فشاں ہو
تو مجُھ کو تم سے گِلہ نہیں ہے
ہَوا کے جھونکے سے کب کسی نے گِلہ کیا ہے؟

اُس کے دشمن !

سحر ہوئی تو کسی نے اُٹھ کر
لہو میں تر اِک سُرخ بوٹی
بڑی کراہت سے
آسماں کے فراخ آنگن میں پھینک دی اور
طویل متلی کی جان لیوا سی کیفیت سے نجات پائی !

مگر فلک کے فراخ آنگن میں
بادلوں کے سفید سگ اُس کے منتظر تھے
جھپٹ پڑے اُس لہو میں تر دِل کے لوتھڑے پر
جھپٹ پڑے ایک دوسرے پر
زمیں کے لوگوں نے دیر تک یہ لڑائی دیکھی
سفید کُتوں کے سُرخ جبڑے
لہو میں تر ایک لال ٹکڑا —— دریدہ سورج
حریص، عزّاتے بادلوں کا طویل، گہرا، مہیب دُکھڑا !!

مری زمیں بھی تو گزشتہ کا لوتھڑا تھی جس کو
کسی نے اندھے خلا میں پھینکا
مگر نہ کوئی بھی اس پہ جھپٹا
تب اُس کے اندر سے آئے باہر
اُسی کے دُشمن
اُسی کی بُو پر
ہزاروں خونخوار، تُند کُتّے
حریص جبڑے
اور اب دریدہ زمین ساری
ٹپکتے گرتے لہو کے قطروں میں رِس رہی ہے
خود اپنے خونخوار تُند بچّوں کے تیز جبڑوں میں پِس رہی ہے!!

انسان

(۱)

دُھوپ کی چادر بِچھی تھی سُو بہ سُو
اور پھٹے، گندے، سیہ پاؤں کے ساتھ
چل رہا تھا دُود صبا چادر پہ تُو
چیتھڑوں میں اُڑ رہی تھی کائنات
ریزہ ریزہ ہو رہے تھے کاخ و کوُ
پھٹ رہے تھے بگڑلوں والے پہاڑ
بن رہی تھی پتھروں کی آب جُو
زلزلوں کے ناگ تھے زیرِ زمیں
تھی سیہ گھوڑوں کی وحشت جن کی خُو
آسماں بیمار اور موسم خراب
گھاس کو گہنا رہی تھی گرم لُو،
اور تُو خود بُوئے گُل کی چاہ میں
پھر رہا تھا گھاٹیوں میں سُو بہ سُو
بُوئے گُل لیکن ہوا پر تھی سوار
اور ترا مرکب تھی تیری اپنی بُو

(ح)

تُو جنگل کی آگ بھی، تُو نے،
تیز ہَوا پر تخت بچھایا،
ہاتھوں پر چاندی پھیلائی
ماتھے پر چندن چپکایا،
سُرخ عروسی جوڑا پہنا
لال بھبھوکا مُکھڑا پایا
اسپ سفید کی باگیں تھامیں
اُور اس کو سرپٹ دوڑایا
بھُوری جنگلی گھاس پہ تُو نے
شعلوں کا قالین بچھایا،
پیڑ جلے، شاخیں کمہلائیں
اور پتّوں نے شور مچایا،
چیخ اُٹھے سب پنکھ پکھیرو
دوڑ گیا ہرنوں کا سایا
ایک انار سا چھُوٹا لب پر
کرنوں نے کُہرام مچایا
راکھ ہُوا نہ جب تک جنگل
تیرے مَن کو چین نہ آیا،

(و + ح)

خستہ دِلوں کا قصّہ سُنائیں کِسے کہ اب
ہنستے تڑپتے، بولتے لفظوں کی بات ہے

موجِ ہوائے قہر کی صورت ہے تُو رواں
شامل ترے جلوس میں ہر خشک پات ہے

بست و کشودِ چشم سے ہے دِل کا جزر و مد
ہونٹوں کے زیر و بم سے بندھی کائنات ہے

فُرصت کہاں کہ رُک کے سُنے تو کسی کی بات
مُٹھی میں تیری سلسلۂ شش جہات ہے

ڈوبے جو آفتاب تو تیری رضا ہے یہ
پھُوٹے سحر تو اس میں بھی تیرا ہی ہات ہے

اُوپر فلک ہے جس کی نہایت نہیں کوئی
نیچے زمیں ہے جس پہ فقط تیری ذات ہے!!

سمندر اگر میرے اندر آ گرے!

سمندر اگر میرے اندر گرے
تو پایاب لہروں میں ڈھل کر سُلگنے لگے
پیاس کے بے نشاں دشت میں
وہیل مچھلی کی صُورت تڑپنے لگے
ہارپونوں سے، نیزوں سے چھلنی بدن پر
دہکتی ہوئی ریت کے تیز جبڑے سہے
اور پھر ریت پر جھاگ کے کچھ نشاں چھوڑ کر
تا ابد سر بریدہ سے ساحل کے سائے میں
"ہونے نہ ہونے" کی میٹھی اذیت میں کھویا رہے!

یہ 'ہونے نہ ہونے' کی میٹھی اذیت بھی کیا ہے!
نگاہیں اٹھاؤں تو حدِّ نظر تک
ازل اور ابد کے ستونوں پہ باریک سا ایک خیمہ تنا ہے

("نہ ہونے" کا یہ رُوپ کتنا نیا ہے)

اور خیمے کے اندر

کروڑوں ستاروں کا میلہ لگا ہے

("یہ ہونے" کا بہروپ لا انتہا ہے)

مرا جسم
ریشم کا صد چاک خیمہ
کسی بے کراں دشت میں بے سہارا کھڑا ہے

مگر جب میں آنکھیں جھکاؤں

تو اس سرد خیمے کے اندر

کروڑوں تڑپتے ہوئے تند ذرّوں کا اِک دشت پھیلا ہُوا ہے

یہ ہونے نہ ہونے کی میٹھی اذیت

عجب ماجرا ہے!!

اگر ازل سے یہی چلن ہے!

سفید لفظوں کے بادبانی جہاز آئیں
خزاں زدہ خشک ساحلوں سے بدن ملائیں
اُچھال دیں اپنے سب خزانے — ہزاروں لاکھوں سفید چوہے
جو چور قدموں، طویل مونچھوں، شریر پنجوں کو آزمائیں
مہیب، کالے، حریص جنگل میں جا بجا راستے بنائیں!

حریص جنگل سے کالے شبدوں کا رقص کرتا ہجوم نکلے
سفید مرمر کے ساحلوں پر عبارتوں کے دیئے جلائے
بڑی ہی نفرت سے سنگِ لرزاں پہ چھوڑ جائے
سقیم ورثہ — جو آنے والی مریض نسلوں کے کام آئے!

سیاہ بادل کے میان میں گر
سفید بجلی چمکتی تلوار بن گئی ہے

اگر تمہاری سیاہ آنکھوں کی گودیوں میں
سنہرے خوابوں کی کشتیاں ہیں
فلک کی کالی زمیں پہ ہر شب
کِھلا ہوا موتیے کے پھولوں کا اک چمن ہے
اگر ازل سے یہی چلن ہے
تو پھر یہ نمناک ساحلوں کے سفید مرمر پہ
کالے شبدروں کا رقص کرتا ہجوم کیا ہے؛
مہیب، کالے، حریص جنگل میں چور قدموں کی چاپ کیا ہے؛
سقیم ورثے کا راز کیا ہے؛

دُھوپ

کہا میں نے — آ
اپنے بر خاب گھر کے مُقفّل کواڑوں کو تُو کھول کر
اُس سمندر کو تک،
جو خنک تیرگی کی سیہ باڑ کو پار کر کے
تیرے گھر کی دہلیز تک آ گیا ہے!

یہ پہلی تمازت کا سیلِ رواں
میرے خستہ بدن سے تھکاوٹ کی میلی تہوں کو اتارے
مرے بند کانوں میں بھونروں کی بانی کا امرت گرائے
مجھے اپنے پھیلے ہوئے زرد دامن میں بھر لے
میں سونے لگوں تو مجھے گُدگُدائے
میں جاگوں تو میرے پپوٹوں پہ
کرنوں کی، خوابوں کی برکھا انڈیلے!

یہ پیلی تمازت کا سیلِ رواں اب
مجھے پار کر کے ترے در پہ دستک اگر دے رہا ہے
تو اپنے مقفّل کواڑوں کو تو کھول — باہر نکل
ہات اپنے ہلا کر اُسے اپنی جانب بُلا
اپنے خستہ بدن پر سے تُو اپنی میّت کا پتھر ہٹا
گھاس کو اِذن دے وہ حسیں سبز قالین اپنا بچھائے
درختوں پہ گجرے نظر آئیں، طائر چہکنے لگیں
برف پگھلے
غضیلی، سرافراز، بے رحم ٹھنڈی ہوا اپنے گھر کو سدھارے
دُکھی فرش سے ماورا عرش تک
دُھوپ کا اک ہمکتا سمندر رہے موجزن
جس میں تُو — اور میں
سُرخ بجروں کی صورت، نہ ڈوبیں نہ اُبھریں
فقط دُھوپ کو اپنے چہروں پہ مل کر کہیں
ہم امر ہو گئے ہیں!!

دُعا

بیاضِ شب و روز پر دستخط تیرے قدموں کے ہوں
بدن کے پسینے سے قرنوں کے اوراق مہکیں
صبا تیرے رستے سے کنکر ہٹائے
فلک پر گرجتا ہوا گرم بادل
ترے تن کی قوسِ قزح کا
لرزتا، دمکتا ہوا کوئی منظر دکھائے
تجھے ہر قدم پر ملیں منزلیں
ہوا کے ایک باریک سے تیز چابک کی صُورت
تری بند مٹھی میں دبکی رہے
سدا تجھ کو حیرت سے دیکھے زمانہ
تُو بہتے ہوئے تیز دھاروں کی منزل بنے
بادباں سارے تیری ہی جانب کھُلیں
اور اُفق کی منڈیروں پہ کُونجوں کی لمبی قطاریں

تری منتظر ہوں

اگر میں زمیں کے سیہ، تنگ پاتال میں گر بھی جاؤں تو کیا ہے
تجھے تو زمیں کورے کاغذ کی صورت ملے

بیاضِ شب و روز پر دستخط تیرے قدموں کے ہوں
چہکتے ہوئے تیز نٹ کھٹ زمانے

ترے گرد ناچیں
تو بنسی کی تانوں سے ہر شے کو پاگل کرے، نذرِ آتش کرے
توڑ ڈالے
مگر خود نہ ٹوٹے
کبھی تو نہ ٹوٹے!!

بیکراں وسعتوں میں تنہا!

سفر میں ہوں اور رُکا کھڑا ہوں
میں چاروں سمتوں میں چل رہا ہوں مگر کہاں ہوں!
وہیں — جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نب سے ٹپک پڑا ہے!
میں خود بھی شاید کسی قلم سے گرا ہوا ایک سُرخ قطرہ ہوں
زندگی کی سجل جبیں پر چمکتی بندیا سی بن گیا ہوں
مگر میں بندیا نہیں ہوں شاید کہ وہ تو تقدیس کا نشاں ہے
دلوں کے دھاگوں کی اک گرہ ہے
گرہ — جو صدیوں میں بننے والے حسین رشتوں کا آشرم ہے
جو آنے والی تڑپتی صدیوں کی ابتدا ہے
گرہ تو جنکشن ہے پٹڑیوں کا، مسافروں کا، نئی نویلی رفاقتوں کا
محبتوں کا، اذیتوں کا

مگر میں تنہا ہُوں — بے کراں وسعتوں میں تنہا!
سفید ماضی، سفید فردا، سفید یہ لمحۂ عبادت
کہ جس پہ کوئی نہیں عبارت
سفید ماتھے پہ سُرخ دھبّہ ہوں
ابتدا، انتہا کے دھاگوں سے کٹ چکا ہوں!

مَیں سُرخ دھبّہ ہُوں
کپکپاتے لطیف عکسوں کا سلسلہ ہوں
تمام چہرے جو تیرے اندر سے جھانکتے ہیں
مرے ہی چہرے کی جھلکیاں ہیں
مرے ہی سینے کی دھڑکنیں ہیں
یہ تیز رنگوں کے تُند دریا
جو دُکھ کے کوہِ گراں سے رس کر
زمیں کی بنجر اُداس سی سلطنت کو چھُو کر
اس ایک بے انت سُرخ نقطے کے بحرِ ظلمات میں گرے ہیں
مرے ہی بے نام دست و پا ہیں!
یہ جگمگاتی سی کہکشائیں جو ابتدا سے
خلا کی ظُلمت میں قید باہر کو اُڑ رہی ہیں،
گرہیں بنی ہیں

وہیں کھڑی ہیں

وہیں ــ جہاں سُرخ روشنائی کا ایک قطرہ
کسی قلم کی کثیف نِب سے ٹپک پڑا ہے
وہ ایک قطرہ جو میرا دِل ہے
جو میرے عکسوں کا سِلسلہ ہے
جو میرے ہونے سے سُرخرو ہے
جو میری پابستہ آرزُو ہے !

ازل سے ابد تک

پرندہ ہَوا ہے
ہَوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لَوٹ جانے کا اِک سلسلہ ہے
میں اس سلسلے کے پُراسرار سے زیر و بم میں رواں ہوں
مسافت کے دریا میں، موجوں کی زد پر
ہواؤں کی ٹھوکر پہ آیا ہُوا ابر کا ایک بجرا ہوں
بجرے کا تنہا مُسافر ہوں
دریا کے دونوں کناروں میں سیّال سا رابطہ ہوں
ازل سے ابد کی طرف
اور ابد سے ازل کی طرف بہہ رہا ہوں!

زمانوں کے سارے معطّر مکاتیب پر میرے "ہونے" کی مہریں لگی ہیں

مَیں ہر نامۂ معتبر کی جبیں پر کھُدا ہوں

دِلوں کے کڑے فاصلے، میری سچّی گواہی نہ ہو تو کبھی ختم ہوتے نہیں ہیں

مَیں تارِ نظر ہوں، مَیں یادوں کی برکھا ہوں

بہتے ہوئے چاند کی روشنی ہوں کہ جس میں سبھی

غُسل کرنے پہ مجبور ہیں

دوستوں دشمنوں میں مرے دم قدم ہی سے ترسیل کا سلسلہ ہے!

مَیں تارِ نظر ہوں

میں سیّال سا رابطہ ہوں

مقدّر میں میرے لکھا ہے کہ مَیں سانس بن کر

اِک اِک تن میں اُتروں، اِک اِک تن سے باہر کو آؤں

زمانوں کو تازہ لہو کی حرارت مہیّا کروں

ہست کو نیست ہونے سے ہر دم بچاؤں

مگر اپنی خاطر کوئی جسم ہرگز نہ مانگوں

کسی ایک منزل پہ رُکنے نہ پاؤں

عجب فیصلہ ہے!

عجب یہ سزا ہے!

ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت میں اُڑتا پھروں
اپنی صُورت کو ترسا کروں
اپنی تجرید میں خوش رہوں

اور زندہ رہوں

اور زندہ رہوں!!

نبّاض

روگ
باہر کی طرف آئے
تو چہرے پہ لکیریں اس کی
یُوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ اُبھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں!

میں نے نبّاض سے پوچھا کہ مرے روگ کی صُورت کیا ہے؛
(کیسا نبّاض ہے وہ — بات تو کرتا ہی نہیں
اُس کے ہونٹوں پہ چمکتی ہوئی آیات مگر
اُس کے اندر کی کسی شے کا پتہ دیتی ہیں)
اُنگلیاں اُس نے مری نبض پہ رکھ دیں تو معاً
اُس کے ہونٹوں پہ مہکتی ہوئی آیات کا کہرام اُٹھا
اور چہرے کی لکیروں نے دہن کھول دیئے

اُس نے کاغذ پہ لکھا : روگ تمہارا یہ ہے ــــ !
میں نے کاغذ پہ لکھا : روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے !
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے

روگ باہر کی طرف آئے تو چہرے پہ لکیریں اُس کی
یوں چمکتی ہیں کہ جیسے وہ ہتھیلی پہ ابھرتی ہوئی ریکھائیں ہوں
گرم شہروں کی اُدھڑتی ہوئی سڑکوں کی طرح
اور اُن کھیتوں کے مانند جو اپنے ہی پسینے میں شرابور ــــ
مکانوں کی غلاظت میں دھنسے اُجلے مکینوں ایسے
نبض پر انگلیاں رکھتے میں کھڑا ہوں کب سے
جانتا ہوں کہ اگر میں نے کسی پُرزے پہ کچھ لکھا تو وہ
اُسی کاغذ پہ اُگل دے گا وہ سب کچھ
جو مرے دُکھتے ہوئے جسم کے ہر انگ میں ہے
میرے سینے کے نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے !

روگ آواز نہیں ہے کہ اسے گہری لکیروں میں کوئی بند کرے
اور پھر نبض پہ انگلی رکھ کر
اِک گھِسے نغمے کی بیٹھی ہوئی سسکار سُنے

روگ آئینے کی صورت ہے ۔ اسے کوئی اگر
رُو برُو لائے تو سو زنگ میں لَو دیتا ہے
ورنہ پتھر ہے کہ صدیوں سے پڑا ہے بے حس
زنگ اور دھول کی چادر میں چھپائے خود کو
اپنے اندر کی غلاظت سے سجائے خود کو !

واپسی

گلی بھی وہی ہے
مکاں بھی وہی ہے
وہی ہے مکاں کا پُراسرار بے نُور زینہ
مگر چور قدموں کی بے نام آہٹ
ملائم لبادے کی محجوب سی سرسراہٹ
"ہٹو، راستہ چھوڑ دو" کی چمکتی غصیلی ادا
پھر، ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
وہ صدا اب نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے
کہیں کچھ نہیں ہے
خموشی کی بھیگی ہوئی التجا کے سوا

یہ سنسان زینہ کہ صحرا کی صورت ہے پھیلا ہُوا
اس کی ٹھہری ہوئی، ریت ہوتی ہوئی سلوٹوں میں کہیں

رُت کے پھُولوں کی بکھری ہوئی پتیاں اب بھی ہوں گی
لرزتے ہوئے مکڑیوں کے پُراسرار جالوں میں
سرگوشیاں
چھُو لیتے نرم دھاگوں میں لپٹی ہوئی
اَن کہی داستاں کی طرح بے زباں اب بھی ہوں گی
گھِسی اور اُکھڑی ہوئی چھوٹی اینٹوں پہ
مہندی کی سُرخی کا مدھم سا کوئی نشاں اب بھی ہوگا
مگر — تازہ پھُولوں کی پاگل مہک
اور مہکتے لبادے میں اُجلا بدن
اور کھنکتی ہنسی
پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا
تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کا مدھر سلسلہ
وہ مدھر سلسلہ اب کہاں ہے!
زمانے کے جالے میں محبوس، گھُٹتی ہوئی یہ صدا
جس کی خاطر تُو سنسان زینے کے پہلے قدم پر کھڑا ہے
صدا تو نہیں ہے
فقط لاش ہے ایک مُردہ صدا کی !!

اِک تنہا بے برگ شجر!

کون مجھے دُکھ دے سکتا ہے!
دُکھ تو میرے اندر کی کشتِ ویراں کا
اِک تنہا، بے برگ شجر ہے
رُت کی نازک لانبی پوریں
۔کرنیں، خوشبو، چاپ، ہوائیں
جسموں پر جب رینگنے پھرنے لگتی ہیں
میرے اندر دُکھ کا سویا پیڑ بھی جاگ اُٹھتا ہے!
تنگ مساموں کے غرفوں سے
لمبی، نازک شاخیں پھن پھیلا کر
تن کی اندھی شریانوں میں قدم قدم چلنے لگتی ہیں
شریانوں سے رگوں، رگوں سے نسوں کے اندر تک
جانے لگتی ہیں
پھر وہ گرم لہو میں مِل کر

اِک اِک بال کی جڑ تک پھیلتی جاتی ہیں
اور یہ میرا صدیوں پرانا مسکن، خاکی مسکن
خود بھی ایک شجر بن جاتا ہے
وقت کی قطرہ قطرہ ٹپکتی
سُرخ زباں کی نوک پہ آکر
جَم جاتا ہے!!

وہ اِک تازہ شَے!

وہ اِک تازہ شَے جو درختوں میں ہے
اور پرندوں میں ہے
بانس کے گنگناتے ہوئے جنگلوں
اوس کھائی ہوئی گھاس کی سلوٹوں
ہل چلے کھیت کی گرم سانسوں میں ہے
نرم بھادوں میں ہے
پوست کی کیاریوں میں، لجائی ہوئی دلہنوں
کے معطّر لبادوں میں ہے!

وہ اِک تازہ شَے
جو گھنے شہر کے ہر محلّے
کے اونچے مکاں کی سیہ رنگ ممٹی پہ
سُورج کی پہلی کرن بن کے آتی ہے

گندی منڈیروں پہ ٹھوڑی ٹکائے
گلی کے سیہ فرش کو گھورتی ہے
مگر تنگ زینے سے نیچے اُترتی نہیں ہے

وہ اک تازہ شے
جو تری آنکھ کے نیم وا سے دریچے میں
مٹی کا صدیوں پرانا دیا بن کے جلتی رہی ہے
مگر اب نہیں ہے!!

اِک سیّال سونے کا — ساگر!

کِس نے دیکھا
اِک سیّال سونے کا — ساگر
پتّھر دِل ساحل سے اپنا پنڈ چھُڑاتا
مچل مچل کر گرتا اُٹھتا اور غُرّاتا

کِس نے دیکھا
اِک سیّال سونے کا — ساگر
تن کی بوڑھی دیواروں سے باہر آتا
بُجھے ہوئے تاریک بدن کو
کُندن رُوپ کی شوبھا دے کر
پلکوں کی نوکوں پر رُکتا
گالوں پر سُرخی پھیلاتا

کس نے دیکھا

اِک سیّال سونے کا — ساگر
سُورج کی اکلوتی آنکھ سے ٹپ ٹپ گرتا
سارے جگ پر کرنوں کی برکھا برساتا
جھلمل کرتے پیلے پیلے پھُول ہزاروں
ہر پھیلے دامن میں گراتا
ہنستا، روتا، شور مچاتا!

حادثہ

بے آواز تھے آنسو اُس کے
چھوٹے چھوٹے پیر تھے اُس کے
تن — جیسے رُوئی کا گالا
رنگ تھا کالا!

ندی کنارے تک پیروں کے
سارے نشان سلامت تھے
پار ندی کے کچھ بھی نہیں تھا

پار ندی کے کچھ بھی نہیں ہے
ساری راہیں ندیا کے اندر جاتی ہیں
اور پھر وہیں کی ہو جاتی ہیں
چھوٹے چھوٹے پیر برہنہ ریت کے اوپر پھول کھلا کر

ندی کنارے تک جاتے ہیں
اور پھر پار کہاں جاتے ہیں!

ہر بچّے کو
اُڑتی تتلی سرگوشی میں بتلاتی ہے
ماں تیری، ندیا کے اندر
دُودھ کا اک مشکیزہ لے کر
تیرا رستہ دیکھ رہی ہے!

کون بتائے ان بچّوں کو
ماں ندیا کے اندر کب ہے!
ماں تو خود اک تیز ندی ہے
ماں — اِک دُودھ بھری ندی ہے!!

برف

اب کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں
اب رات کی پھیلی شاخوں پر
اک بھی تو لرزتا پات نہیں!

اک جھونکا تپتے صحرا کا
اس پیڑ سے آ ٹکراتا تھا
ہر پتّہ شور مچاتا تھا
وہ جھونکا اب کس حال میں ہے
افلاک پہ ہے پاتال میں ہے؟
مَیں پیڑ کے نیچے گھٹنوں پر
کیوں سر رکھے تا دیر رہوں
اور اُس کی سندر چاپ سُنوں
جو رات کو روتا چھوڑ گیا

اور خوشبو سے مُنہ موڑ گیا

اب دُھول سنہری بکھری ہے
اور چاند کی چاندی نکھری ہے
اور شبنم ہنسی اُڑاتی ہے،
وہ باس کہ بھینی مُٹھی میں تھی
پوروں سے ٹپکتی جاتی ہے
اب کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں
اِک برف مسافت دُور تلک!
اِک ٹھہری ساعت دُور تلک!

آدھی صدی کے بعد

(طویل نظم)

۱۹۷۹ ——— ۱۹۸۰

جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مسافر اُتار کے

آدھی صدی کے بعد

ہر کوہ پیما اس بات کی تصدیق کرے گا کہ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اُس کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر جب وُہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے کے بعد اس کی دوسری جانب اُترتا ہے تو اس کی رفتار میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہونے لگتا ہے تا آنکہ اُسے خود کو نشیب میں گرنے سے باز رکھنے کے لیے کسی نہ کسی چٹان یا شاخ کو بطور بریک استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ پھر جب وُہ رُکتا ہے تو اُس کی سوچ پَر پھیلائے اُلٹی سمت میں پرواز کرتے ہوئے اُن تمام فاصلوں کو دوبارہ طے کرتی ہے جن سے گزر کر وُہ یہاں تک پہنچا تھا۔ وُہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اُس نے اپنے سفر کے دوران کن کن رکاوٹوں کو عبور کیا، کن کن مناظر سے لطف اندوز ہُوا، زندگی اور موت کے ٹکراؤ سے پھُوٹنے والے لمحات میں اُس نے کن اَن چھُوتے احساسات کو مَس کیا اور کیا اُس پر زندگی کے اَن گنت رازوں میں سے کوئی ایک راز بھی منکشف ہو سکا؟

میری حالت بھی کسی کوہ پیما سے مختلف نہیں۔ مَیں بھی ایک عرصہ سے عُمر کے پہاڑ کی چوٹی کو چھُو لینے کے بعد اُس کی دوسری جانب چٹانوں اور درختوں سے ڈھکی ہُوئی ڈھلوان پر سے مسلسل لڑھک رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کہیں چند لمحوں کے لیے رُک کر بیتے ہُوئے لمحات کی بازآفرینی کر دوں اور اُن تمام مسافتوں کو تخیل کی آنکھ سے دیکھوں جنہیں مَیں اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ مگر ڈھلوان پر پھسلن اتنی زیادہ ہے کہ مَیں کوشش بسیار کے باوجُود کہیں رُکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مگر نہیں! مجھے رُکنے کا کم از کم ایک موقع ضرور مِل چکا ہے۔ یہ موقع مجھے پچھلے سال ملا جب مَیں ایک روز شہر کے سب سے بارونق بازار میں سے گزر رہا تھا۔ اُس وقت یہ انوکھا احساس میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ مَیں نے اپنے بچپن میں جن بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو اس بازار میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اُن میں سے بیشتر پہاڑ کے اُس طرف نشیب میں گم ہو چکے ہیں مگر بازار میں بچپن، جوانی اور بڑھاپا اُسی طرح مصروفِ خرام ہیں۔ تو کیا زندگی کا

سفر کبھی نہ فنا ہونے والے ادوار میں منقسم ہے؟ - کیا اس شاہراہ پر بچپن جوانی اور بڑھاپا محض تین سُرنگیں ہیں جن میں سے ہر مُسافر کو بہرحال گزرنا ہے؟ —— لُطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر سُرنگ کا ایک اپنا رنگ' ایک اپنی خوشبُو ہے - مُسافر جب اس میں سے گزرتا ہے تو سُرنگ کا رنگ اور خوشبُو اُس کے بدن بلکہ اُس کی شخصیت تک کو تبدیل کر دیتی ہے مگر سُرنگ کسی عنوان بھی تبدیل نہیں ہوتی - وُہ اپنی جگہ پر سدا سے قائم ہے اور شاید ہمیشہ قائم رہے گی -

جب مجھے زندگی کے ان ادوار کے بارے میں یہ احساس ہُوا کہ ان میں سے ہر دَور دو سنگ ہائے میل کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُکا کھڑا ہے تو مجھے صاف نظر آ گیا کہ مَیں خُود وقت کی ایک کروٹ کی طرح ان ادوار میں سے گزرتا رہا ہوں اور گزرتے ہُوئے ہر دَور کی خوشبُو اور رنگ میں بھیگتا چلا گیا ہوں - اگر یُوں ہے تو پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ مَیں آگے جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے اپنے ہی نقوشِ قدم پر واپس جاؤں اور دیکھوں کہ وہاں کیا ہے جہاں سے مَیں آنکھیں بند کیے ایک سحر زدہ انسان کی طرح گزرتا رہا؟ میری طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" دراصل میری اس واپسی کے سفر ہی کی داستان ہے بلکہ یہ تو بجائے خُود ایک مُہم ہے - کیونکہ واپسی کے سفر میں مجھے پہلی بار وُہ سب کُچھ نظر آیا ہے جو ان طویل مُسافتوں میں ہمہ وقت دعوتِ نظارہ تو دیتا ہے مگر جو مجھے اپنے سفر کے دوران محض اس لیے نظر نہ آیا تھا کہ میری آنکھ بیدار نہیں تھی -

یہ نظم پانی کے دھارے کو بطور ایک تمثیل پیش کرتی ہے - پانی کا دھارا کبھی جھرنوں کی صُورت میں ہمکتا اور اُچھلتا دکھائی دیتا تھا - یہ اس کا بچپن تھا - پھر وُہ پُرشور ندی میں ڈھل کر چٹانوں سے سر پھوڑتا اور کروٹیں لیتا نظر آیا - یہ اس کی جوانی تھی - پھر وُہ طویل و عریض میدانوں میں بڑے اعتماد سے مصروفِ سفر ہُوا - اور آخر آخر میں اَن گنت چھوٹے چھوٹے دھاروں میں بٹ کر سمندر میں اُترتا چلا گیا - مگر مَیں نے محسوس کیا کہ جھرنا، ندی، دریا اور سمندر تو محض سانچے

ڈَن۔ پانی کی سیّال رَو جب گزرتی ہے تو ہر سانچے میں ڈھل کر اپنی صُورت تبدیل کر لیتی ہے۔

مَیں اس نظم کو ایک داخلی اوڈیسی کا نام دیتا ہوں۔ یہ نظم پانی کی سطح پر ڈولتی تھرکتی ہُوئی کشتیوں کو تو چُھوتی ہے مگر دراصل پانی کے اندر اُترتے ہوئے ان کے عکسوں کی تلاش میں ہے۔ اس نے زندگی کو ایک آئس برگ کی صُورت میں دیکھا ہے جس کا تھوڑا سا حصّہ پانی کی سطح پر اور بیشتر حصّہ سطح کے نیچے ہے۔ مگر ساتھ ہی اس پر یہ بات بھی منکشف ہُوئی ہے کہ ہر چند آئس برگ خُود بھی پانی کا ایک تودہ ہے تاہم اس کا وجُود ایک زندہ حقیقت ہے جسے سَراب کہہ کر مُسترد نہیں کیا جاسکتا۔

اس نظم میں حوالوں کی تعداد زیادہ نہیں اور جو حوالے آئے ہیں ان کے تناظر سے بھی جدید نظم کا ہر اچھّا قاری واقف ہے۔ پھر بھی اس بات میں کوئی قباحت نہیں کہ جدید نظم کے اُن طلبار کے لیے جن کے مطالعہ کا اُفق ابھی وسیع نہیں ہے، ان حوالوں کے سلسلے میں کچھ اشارے کر دیئے جائیں۔ مثلاً اس نظم میں پہلا حوالہ "سویمبر" کا ہے۔ سویمبر قدیم ہندوؤں کی ایک رسم تھی جس میں لڑکی اپنا شوہر خود منتخب کرتی تھی۔ نظم میں اشارہ سویمبر کے موقع پر تیراندازی کے مقابلے کی طرف ہے۔ ——— دُوسرا حوالہ اوڈیسس کا ہے۔ اوڈیسس یونان کی ایک رزمیہ داستان کا ہیرو ہے جس کی جہاں گردی اور مہم جُوئی ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ نظم میں اوڈیسس آوارہ خرامی کی علامت ہے۔ تیسرا حوالہ قاف کا ہے۔ قاف ایک پہاڑ ہے جو ایشیائے کوچک کے شمال میں واقع ہے۔ پُرانے لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں پریاں آباد ہیں۔ چوتھا حوالہ شانگری لا کا ہے۔ شانگری لا شہرۂ آفاق ناول "لاسٹ ہورائیزن" کا ایک خیالی شہر ہے۔ جو تبّت میں کہیں واقع ہے۔ جہاں وقت تھم چکا ہے اور لوگوں کی عُمریں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی ہیں۔ اِس شہر کو دُوسری جنگ عظیم کے دوران اُس وقت شہرت ملی جب ایک سوال کے جواب میں کہ مشرقِ بعید میں امریکہ کے فوجی اڈّے کس کس مقام پر ہیں، روزولٹ نے مُسکرا کر کہا تھا کہ یہ سب اڈّے شانگری لا میں واقع ہیں۔ نظم میں پانچواں حوالہ "لچھمن ریکھا"

کا ہے۔ بن باس کے زمانے میں جب ایک روز سیتا نے رام سے ایک خوبصورت ہرن پکڑ لانے کی فرمائش کی تو رام نے کٹیا سے باہر جاتے ہوئے اپنے بھائی لچھمن سے کہا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں سیتا کی حفاظت کرے۔ جب کافی دیر تک رام نہ آئے تو سیتا نے لچھمن سے کہا کہ وہ ان کو جا کر تلاش کرے۔ لچھمن سیتا کو یوں اکیلا چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں تھا لیکن جب سیتا نے اُسے مجبور کیا تو اُس نے کٹیا کے گرد لکیر کا ایک حصار سا کھینچتے ہوئے سیتا سے کہا کہ یہ لکیر گرہست کی لکیر ہے جسے وہ کسی صورت بھی پار نہ کرے۔ بعد ازاں یہ لکیر لچھمن ریکھا کہلائی۔ داستان میں درج ہے کہ جب لچھمن چلا گیا تو سیتا نے اس لکیر کو عبور کیا اور راون جو گھات لگائے بیٹھا تھا، اُسے اُٹھا کر لے گیا۔ آخری حوالہ یم راج کا ہے مگر اس کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔ یم راج ہندو دیو مالا میں موت کے فرشتے کا نام ہے۔

میری یہ نظم بیسویں صدی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان پچاس سالوں میں ملکی، غیر ملکی اور شخصی سطح پر جو واقعات رونما ہوئے اِس نظم کا موضوع نہیں ہیں مگر ان واقعات اور سانحات نے میری ذات کے اندر جو گھاؤ پیدا کئے اور جو نشیب و فراز جنم دیئے ـــــ ان سب کی بازآفرینی اور ان کے وسیلے سے زندگی کے پُراسرار "معنیٰ" تک رسائی کی کوشش ـــــ بس یہی اس نظم کا میدانِ تگ و تاز ہے۔ میں اس نظم کے ذریعے اپنے باطن کو صورت پذیر کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو نظم کا قاری ہی کر سکے گا۔ میرے لیے بس یہ اعزاز ہی کافی ہے کہ میں نے، چند لمحوں کے لیے سہی، لچھمن ریکھا کو عبور کر کے زندگی کے چوتھے کھونٹ کی طرف جانے کی کوشش تو کی!

وزیر آغا

لاہور۔ یکم جنوری ۱۹۸۱ء

جھرنے

○

شب کا پچھلا پہر
پھڑپھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پُورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
رات — اِک آبنوسی جواں رتھ
شرارے اُگلتے ہُوئے اسپِ وحشی
کے پلّو سے بندھنے کو تیّار!
ہلکی ہلکی ہوا
اور مَیں
اپنے معصوم دل میں
مسرّت کی دولت چھپائے
شکستہ سی اِک بیل گاڑی میں
خوشبُو میں لپٹی ہُوئی چھٹیوں کو

کھلونوں کی صُورت
دھڑکتے ہُوئے اپنے سینے سے بھینچے
قلاقند اور شہد ایسے دنوں
رس بھری نرم جامن سی
تازہ رُتوں کے لیے
کتنا بیتاب!
اور منتظر!
منتظر اُس چمکتی ہُوئی ایک ساعت کا جب
بیل گاڑی
مرے گاؤں کی گرم شہ رگ میں
اُترے
معاً بیل گاڑی سے مَیں کُود کر
باہیں کھولے ہُوئے اپنے گھر میں
لپک کر گھسُوں
ماں کے سینے سے ٹکراؤں
ہونٹوں کے حیرت سے کھُلنے کا
اور پپوٹوں کے پھٹنے کا منظر
مَیں دیکھوں

مسرت کی زر تار کرنوں میں
لپٹے ہُوئے
نرم بوسوں کی شبنم کو
اُلجھے ہُوئے اپنے بالوں پہ
گرتے سُنوں
پھر مَیں ہنسنے لگوں!

○

پھر مَیں ہنسنے لگوں
اور گزری رُتیں لوٹ آئیں
پرندوں کی چہکار — مانوس
گائے کے نازک تھنوں سے
اُترتی ہُوئی دُودھ کی دھار
تازہ
مہکتے ہُوئے گرم تنور کی کوکھ سے
دم بدم جست بھرتی
سُنہری چنگیروں
میں ٹپ ٹپ اُترتی ہُوئی
روٹیاں
روٹیوں پر جھپٹتے ہُوئے
ہات
چھوٹے چھوٹے سے ہات!

گول بوٹی
رکابی کی دُلہن
اُڑتا ہُوا سورماؤں کا لشکر
سوئمبر کا منظر
بدن کی کمانوں سے
نظروں کے تیروں کی
بھُوکی لپک
جیت کے قہقہے
ہار کی سسکیاں
پھر قمیصوں کی اُڑتی ہُوئی دھجیاں
پھر کسی شے کے گرنے کی
آواز
اور بھاگتے دوڑتے پاؤں کی جوڑیاں
جوڑیوں کے تعاقب میں
دادا کی چیخوں میں ڈھلتی ہُوئی گالیاں
پھر خموشی
خموشی کی اِک چادرِ آبگوں
دوپہر تک سکوں!

○

دوپہر تک سکوں
دوپہر — دھُوپ
اور آسماں
دھُوپ کا سائباں
اور تلووں کے نیچے
دہکتی زمیں
نہر میں کُودتے
ننّھے مُنّے برہنہ بدن
"گاچِتنی" ایسے پانی میں
گرتی ہُوئی تختیاں
مُردہ لفظوں کے بہتے ہُوئے
پھُول
اور پتّیاں
دھُوپ کی قاش ایسے

سُنہری بدن

زرد پانی میں جیسے ہُمکتا چمن
پھر وُہ بادل کے پازیب کی
چھن چھنن
مَست پرُوا کا نازک ہنڈولا
ہنڈولے میں تتلی
چلو آؤ تتلی کو پکڑیں
چلو، ہاں چلو
سُرخ تتلی کے پیچھے چلو
اِک تعاقب، تجسّس
پکڑنے کی خواہش
اُسے، جس کا کوئی بدن
اور نہ چہرہ
فقط اِک ہیولیٰ
فقط اِک ہیولیٰ کہ جس کے
تعاقب میں آدھی صدی
جیسے اِک پَل کی صوُرت
گزُرتی گئی!

○

دن کا پچھلا پہر
اور اُڈیسس
اوڈیسس کے جرّار ساتھی
چری، باجرے، دھان اور نیشکر
کے پُراسرار کھیتوں کا
کالا سمندر
سمندر میں لکڑی کے تختے
شکستہ سے تختوں پہ
کیچڑ کے چیچک نما داغ
چہروں پہ چپکائے
بالوں کے چھجّوں کے نیچے
چمکتی ہوئی تیز آنکھیں سجائے
ٹڈی کے رنگین انڈوں
حسیں چھتریوں والی کھمبوں
چھنکتے ہوئے

ہریلوں
نیل کنٹھوں، بھجنگوں
کے اُجلے پَروں کے لیے
اِک انوکھی تڑپ
ننّھے سینوں
کے جھَرنوں کے اندر
چھلکتی ہُوئی
بے قراری
سمندر کے اندر
سمندر!

○

سرِ شام
سوندھی سی خوشبو سے
سرشار
بھٹّی پہ بونوں کی
یلغار
دانے،
ہرے لانبے بھٹوں سے ٹوٹے ہوئے
زرد دانے
پٹاخے
سلگتی ہوئی ریت پر
زرد دانوں کا کِھلتا چمن
دُور ـــــ مغرب میں
جلتی ہوئی شام
سُرخ بھٹّی پہ جیسے کڑھائی
کڑھائی میں

ہنستے، تڑپتے، اُچھلتے ستاروں کا
گُلزار
جلتی ہُوئی شوخ آنکھوں کے گُلزار پر
خندہ زن !

○

شب کی کالی قبا
اور درختوں کے بھاری ذخیرے کے پیچھے
گھسٹتا، محافظ شعاعوں کے
گھیرے میں، آگے کو آتا ہُوا
چاند
گاؤں کے لڑکوں کی
تیر و تبر سے مسلّح سپہ
اپنے سالار کے حکم پر
آگے بڑھتی
شعاعوں کے نیزوں سے ٹکراتی
پَل پَل اُلجھتی
سُموں سے اُڑاتی وُہ ذرّے
جو دُشمن کو بے بس کریں
پھر
زمیں سے فلک تک

کبڈی کی "شوکر"

مقفل سے اک دائرے میں
بکھرتے، سمٹتے ہوئے
چاند جسموں کی لہریں
بپھرتا ہوا شور
چیخیں
مسرت بھری تیز چیخیں
ہوا میں معلّق
گھنی گرد کا نقرئی جال
اور بھوت ہی بھوت
بھوتوں کے گرداب میں
چاند کی لاش
نیزوں کی نوکوں پہ
ٹھہری ہوئی!

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہُوئے زخم پر جیسے پھاہا
بدن کو تھپکتی ہُوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہُوئی
ریشمی اُنگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سُلگتی ہُوئی اِک کہانی کے پَر
سات رنگوں کے پَر
قاف کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لیے
شاہزادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہُوا
پہاڑوں کا دامن تہی تھا

پری اُس کی اپنی ہی آنکھوں کی
پایاب سی باؤلی میں
مکیں تھی
مگر شاہ زادے کی آنکھیں تو باہر کی جانب
کھُلی تھیں
پری اُس کی آنکھوں کے غرفوں سے
تکتی تھی اپنے تعاقب کا منظر
تھکا ہارا شہزادہ
لمبا سفر!

○

آج آدھی صدی کی مُسافت پہ
پھیلے ہُوئے
ایک لمبے سفر سے
مَیں لوٹا ہوں
اور گاؤں
آنسو کے موٹے سے قطرے کی صُورت
مری بھیگی پلکوں کی
چلمن سے لگ کر کھڑا ہے
کسی صاف شفّاف بلّور
مرقد کی صُورت مرے سامنے ہے
مری ماں کو رخصت ہُوئے
جیسے لاکھوں برس ہو چکے ہیں
پُرانے مکانوں،
درختوں، پرندوں میں
کوئی بھی باقی نہیں ہے

مرے شوخ بچپن کی
اب راکھ تک
اُڑ چکی ہے
مگر چاروں جانب
مہکتے ہُوئے گرم تنّور ——
نہر کی کوکھ ——
کھیت کی مینڈھ ——
شب کی کالی قبا

ہر طرف
ہر جگہ
اُلجھے بالوں، چمکتی ہُوئی
تیز آنکھوں میں
بچپن
خنک چاندنی کی طرح
آج بھی موجزن ہے
زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے!

نذّری

○

زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے ؟
زمانہ تو بھیگا ہُوا ایک چابک ہے
میرے بدن پر
مسلسل
انوکھے سفر کی کہانی سی اِک
لِکھ رہا ہے
مجھے لوحِ محفوظ گردانتا ہے
کہ شاید
مَیں خود ایک لنگڑا اتار ستا قلم ہوں
زمانے کے اوراق پر
زخم چسپاں کئے جا رہا ہوں
مِرا کام
اِس کے سوا کچھ نہیں ہے
کہ جب وقت بولے
مَیں لکھنے لگوں

پھر
مَیں جو کچھ لکھوں
اپنے اخبار کو بھیج دُوں
جب وُہ خاموش ہو ——
پر وُہ خاموش ہونا نہیں ہے
پرندے کی منقار پر بیٹھ کر
چہچہاتا ہے
دیپک کی لَو پر
ٹمکتا ہے
تارے کے بھیگے پَروں پر
زُباں کی لرزتی ہُوئی نوک پر
اُس کی روشن صدا
گُونجتی ہے
کبھی چُوڑیوں کی چھنک میں
وُہ آواز دیتا ہے
گاہے وُہ سَر اپنا دیوار پر مار کر
چیختا ہے
کبھی رونے لگتا ہے

یا زور سے بولتا ہے
کبھی قہقہہ بن کے
دیوار کو توڑتا ہے
گلی میں اُتر کر
کسی بھولے بھٹکے ہُوئے
خُشک جھونکے کے جارُوب کی
زد میں آئے ہُوئے
کل کے اخبار کو ڈھُونڈتا ہے
کبھی گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر سوچتا ہے
کبھی خوُد کو پڑھتا ہے
بچپن کے اُجلے ورق کو اُلٹ کر
جوانی کی تصویر کو دیکھتا ہے

○

جوانی کی تصویر کو دیکھتا ہے
تو عارض کی رنگت میں گھُل کر
چنبیلی کی خوشبو میں ڈھل کر
دھڑکتی ہوئی سانس بن کر
پگھلتی ہوئی موم بتّی کی
برستی ہوئی آنکھ میں
ڈولتا ہے
معطّر سی، میٹھی سی سرگوشیوں میں مجھے
اُس زمانے کا منظر دکھاتا ہے جو
مجھ سے اوجھل بھی ہے
اور ہر دم نگاہوں میں لرزاں بھی ہے
مجھ سے کہتا ہے:
وُہ دن بھی کیا دن تھے جب
گھاس کی باس
نیلے فلک پر تھرکتی پتنگیں

چمکتی ہوئی سائیکل
گیند، ریکٹ
ربڑ کے چمکتے ہوئے بوٹ
تانگے کے آدھے بدن پر
سیہ رنگ چادر
سیہ رنگ چادر کے گھونگھٹ سے
تکتی ہوئی شوخ آنکھیں
—— ہر اک شے سے جیسے
ترے دل کے سب تار
جُڑ سے گئے تھے
گلی سے گزرتے ہوئے
جب کوئی چِق لرزتی
تو دل تیرے سینے کی دیوار سے
ٹکریں مارتا
اور گردن کی رگ
اس قدر زور سے پھڑپھڑاتی
کہ جیسے کوئی تازہ پنچھی
شکاری کی مٹھی میں محبوس ہو!

○

ہاں —— وُہ پاگل زمانہ
عجب شان سے آگیا تھا
جوانی نے
بچپن کو اِک کینچلی کی طرح
اپنے تن سے علیٰحدہ کیا
اور خُود
گھر کی دہلیز کو پار کر کے
کُھلے شہر میں
تیز خوشبُو بنی مشتہر ہو رہی تھی
نگاہوں میں نشّہ
لبوں پر دہکتی ہُوئی ایک لرزش
ہر اِک شے کو چھُونے کی
اور چُوم لینے کی بے نام خواہش
لہُو بن کے
نیلی رَگوں میں رواں تھی

اُدھر، شام
پھولوں کا گجرا بنی
رُوبرُو آکے رُکتی
اِدھر مَیں
بڑے باغ کے
سرد پھولوں کی جانب
لپکتا
گلاب ایسے مہکے ہُوئے پھول کو
اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر
بڑے غور سے دیکھتا
پھر دہکتے ہُوئے اپنے عارض کو
برفاب سے پھول کے گال پر رکھ کے
خوشبُو میں سرشار
مدہوش
سپنوں کی بارش میں بھیگا
یُونہی —— ایک بُت سا بنا
شام کی رخصتی تک
دریں —— باغ کے نیم روشن سے گوشے میں

محبوس رہتا
اچانک
شبِ تار اُونچے درختوں
کی شاخوں سے نیچے اُترتی
مجھے چھیڑتی
نرم سپنوں سے بیدار کرتی
یہ کہتی :
اُٹھو، یوں نہ پاگل بنو
گھر کو لوٹو
کہ جب رات آئے
تو کوئی مسافر بھی
زیرِ فلک
یوں ٹھہرتا نہیں ہے!

مگر مَیں تو جیسے
ہَوا کے سمندر میں
ٹھہرا ہُوا اک جزیرہ تھا
مرکز تھا
ہر دم اُبھرتے ہُوئے دائروں کا
مِرے گرد
لمحوں کی چنچل جواں گوپیاں
رقص کرتی تھیں
ہونٹوں سے میرے جو تانیں اُترتیں
منقش سے دھاگوں میں
ڈھل کر
زمانے کی جانب لپکتیں
مَیں سُورج تھا
اور سبز ریشم میں ملبوس
ماتھے پہ جھُومر سجائے

یہ دھرتی
مرے گرد پھرتی تھی
گلیوں کے عاروں
مکانوں کی درزوں
کلس اور مینار کی رفعتوں سے
مجھے جیسے آواز دیتا تھا کوئی
یہ کہتا تھا:
تو
شہر کا دل ہے
دل میں
لہو کی تڑپتی ہوئی بوند ہے
تجھ پہ سارے جہاں کی نگاہیں جمی ہیں
تو پلکیں اٹھا
دیکھ
سارا زمانہ تجھے دیکھتا ہے!

○

اور مَیں
جیسے مَیں خُود بھی
حیرت میں ڈُوبے زمانے کی
آنکھوں سے بس خُود کو ہی
دیکھتا تھا

بدن میرا
جادُو کی نگری تھا
آئینہ صُورت تھا
مُجھ کو دکھاتا تھا
میرا ہی منظر
کبھی ایسے لگتا
کہ جیسے یہ دھرتی بھی
اِک آئینہ ہے
کبھی رات جب بھیگتی
نیند

رُوٹھی دُلہن کی طرح
آنکھ کے گرم بستر سے
باہر نکل کر ٹہلتی
تو میں گھر کی چھت پر
کھُلے آسماں کے تلے
کھُردری چارپائی پہ لیٹا
ستاروں کے
بکھرے ہُوئے مرقدوں پر
دیئے ٹمٹماتے ہُوئے دیکھتا
مجھ کو محسوس ہوتا کہ سارا فلک
ایک ٹُوٹا ہُوا آئینہ ہے
ستارے
چمکتی ہُوئی کرچیاں ہیں
مَیں خود
ہر ستارے کی کرچی میں ہُوں
جیسے کمسن زمیں
اور بُوڑھا فلک
اور معصوم تارے

سبھی میرے ہم راز
سب میرے اپنے ہیں
مَیں
سبز مخمل کی مسند پہ
بیٹھا ہُوں
تینوں زمانے
مرے سامنے
دست بستہ کھڑے ہیں!

مگر پھر
کوئی اُڑتی سرگوشی — تِتلی
نجانے کدھر سے
مِری سمت آتی!
مِری سمت آتی تو مسند سے اُٹھ کر
مَیں تینوں زمانوں کو
بچپن کے، ہمجولیوں کو
گلے سے لگاتا
گلے سے لگاتا تو وُہ
مجھ کو پہچان جاتے
چمکتی ہُوئی کرچیاں
پھر سے آئینہ بن کر
مجھے گھُورتیں
اب وُہ مجھ میں
مَیں اُن میں تھا

لمحوں کا ٹوٹا ہُوا ہار
جُڑ سا گیا تھا
نظر میں
انوکھی سی پہچان آنے لگی تھی
مَیں حیران تھا
دیکھتا تھا
کہ اندھے خَلا میں
زمیں ایک کنکر ہے
کنکر پہ تازہ پھپھوندی لگی ہے
حیات
اِک پھپھوندی ہے
ڈائن ہے
اپنے ہی اعضا کو
رغبت سے کھاتی ہے
کیڑے، مویشی، پرندے
زمیں پر بچھی گھاس
پودے
ہر اک زندہ شے

زندہ شے کا نوالہ بنی ہے
عظیم اور جی دار اِنساں
تو اپنا بھی قاتل ہے
اپنے ہی ساتھی کا
تازہ لہُو پی رہا ہے
یہ عفریت
گالی ہے
بدبُو ہے
دھبّہ ہے
اپنی غلاظت میں ہر روز
اشنان کرتا ہے
اپنے تعفّن کا
خود پاسباں ہے!

○

اچانک مجھے جیسے اُبکائی آتی
غلاظت
مِرے مُنہ سے باہر اُچھل کر
مجھے ڈانٹتی
اور تعفّن
مجھے اپنی مُٹھی میں لے کر
مَسلتا

مِرے چاروں جانب
مکانوں کے پنجر
کتابوں کے معبد
دُعاؤں کے گنبد
بسیں، گاڑیاں
اور فقیروں کے گلّے
مِرا مُنہ چڑاتے
یہ کہتے

کہاں پھر رہے ہو ؟
یہاں لفظ کا کوئی معنی نہیں ہے
یہاں تو فقط گیلی مٹّی ہے
مٹّی کی شکلیں ہیں
بارش کا پہلا ہی چھینٹا پڑا
تو پگھل جائیں گی
اور کیچڑ سے بازار
بھر جائیں گے
تُم بھی مٹّی کے پُتلے ہو
برکھا کے آنے تلک
اپنی صُورت کو باقی رکھو
تم بھرم اپنے ہونے کا
باقی رکھو !

○

اور میں سوچتا
اس قیامت سے
کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا
تو پھر فائدہ؟
کیوں میں بے کار
رسّی کے زینے پہ چڑھتا رہوں؟
مجھ کو لگتا
زمیں اور فلک میں
فقط لاکھوں رسّی کے زینوں کا
اِک سلسلہ ہے
سبھی
جھولتے ڈولتے نرم زینوں پہ
پاؤں رکھے
آسماں کی طرف اُٹھ رہے ہیں
سبھی

باری باری
زمیں کی طرف گر رہے ہیں
نشستوں پہ بیٹھے تماشائی
مُردوں کے پنجر ہیں
آنکھوں کے بے نُور غرفوں سے
سرکس کے بازی گروں کو
خموشی سے تکتے چلے جا رہے ہیں
تو کیا مَیں بھی
اِن روزنوں کے بِلیے
اِک تماشہ دکھاؤں؟
نہیں!
مَیں تماشہ نہیں ہوں
کھلونا نہیں ہوں
مَیں بُجھنے کی
خُود کو بُجھانے کی
شکتی ہوں
اپنا مقدر
مَیں خُود ہوں ——

مجھے
تب مجھے
موت کے لمس کی آرزو
ہر گھڑی گُدگُداتی
مَیں خوشبُو کی صُورت
بدن سے نکل کر اُڑوں
سب پکڑتے رہیں
مَیں نہ ہرگز رُکوں
یا کسی شام
آوارہ پھرتے ہُوئے
رہگزر میں کہیں
گر پڑوں
میرے ماتھے سے تازہ لہُو
ایک فوّارہ بن کر
اُبلنے لگے

پھر کہیں سے
کوئی آ کے
نازک سے ہاتھوں سے
مُجھ کو اُٹھائے
مرے سر کو آغوش میں لے کے
رونے لگے
پہ میں رُوٹھا رہوں
موت کی وادیوں کی طرف چل پڑوں
اور چلتا رہوں
مجھ کو محسوس ہوتا
ہر اِک دل میں خطرہ پھڑکتا ہے:
"یہ مرکزِ ہست
مُجھ سے جُدا ہو نہ جائے
جدُا ہو نہ جائے ——"
مگر میں
خدُا سے
زمیں سے
فلک سے

مَیں تینوں سے رُوٹھا ہُوا تھا
مجھے گندگی میں
گھٹن میں
شکستہ سے رشتوں کی
بپھری ہُوئی گرم منڈی میں
اِک پل بھی رُکنے کی
خواہش نہیں تھی
مَیں اِک سرد جھونکے کی صُورت
مقفّل گھروں پر
بس اِک ہلکی دستک سی دے کر
کہیں دُور ——
بُجھتے دلوں کے
پُراسرار ساحل سے
ٹکرا کے
رُکنے کا خواہاں تھا
مَیں تیرگی
بیکراں تیرگی کے لیے

کیسا پاگل ہُوا تھا!

مَیں پاگل ہُوا تھا
گھنی تیرگی کی گپھا میں
اُترتا چلا جا رہا تھا
کہ تاریکیوں میں
کوئی —— اپنے چاندی سے ہاتھوں پہ
شمعیں جلائے
ستاروں سے نیچے
اُترنے لگا
روشنی کا مُدَوّر دائرہ
میری جانب اُمڈنے لگا
اور پھر ایک دن
مَیں نے دیکھا
مَیں اِک نُور کے دائرے میں
کھڑا تھا
مرے گِرد
سونے کے کنگن کا
حلقہ بنا تھا!!

دریا

مرے گرد
سونے کے کنگن کا حلقہ بنا تھا

زمانہ
سُلگتا ہُوا تیر
قوسِ عدم سے نکل کر اُڑا تھا
اُڑا تھا کہ کنگن کو
کنگن سی دھرتی کو
تاراج کرنے میں اِک
کرب انگیز لذّت تھی
اِک جان لیوا خوشی تھی
مگر مَیں نے دیکھا
زمانے کی رفتار
مرنے لگی
اور اُڑتا ہُوا تیر
رنگیں پَروں کو سمیٹے

درختوں کی پھیلی ہوئی
سبز جھولی میں
بے بس سا ہو کر گرا
ایک تابندہ لمحہ
ازل سے ابد تک کھنچا ایک پُر نور جملہ
ہزاروں سُلگتی ہوئی
ساعتوں
ننھّے مُنّے کروڑوں
چمک دار لفظوں میں
ڈھلنے لگا

تب ہوا نے
بیاض زمیں کھول دی
اور رنگین اوراق
اُڑنے لگے
لفظ
جملوں کی شاخوں سے نیچے
اُترنے لگے

مکڑیوں
شہد کی مکھیوں
اور ریشم کے کیڑوں میں ڈھل کر
تھرکنے لگے
سُرخ چڑیاں سی بن کر
پھُدکنے لگے

ابر پاروں
گلابی پتنگوں کی صُورت
فلک کی طرف اُٹھ گئے

قطرہ قطرہ
زمیں کے بدن پر
انوکھی، پُراسرار بھاشا میں
اک ساتھ جینے کی، مرنے کی
تحریر لکھنے لگے

مَیں نے دیکھا
پُراسرار سی روشنی
پھیلتی جا رہی تھی
پہاڑوں، درختوں، کتابوں

کی خوشبو مجھے چھیڑتی تھی
زمیں پر بچھی ندیاں
بے قراری سے
اِک دُوسری کی طرف
آ رہی تھیں
گلے مل رہی تھیں
کشادہ
سجل
بانکے دریا کو
گھیرے میں لے کر
مہکتی چلی جا رہی تھیں

○

معاً مَیں نے
پھُولوں کے گجروں کی درزوں سے دیکھا
مَیں ندیوں کے جھُرمٹ میں محصُور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا
پیازی سے گالوں کے
بلوریں
میرا چہرہ چھُپا تھا
چمکتی ہُوئی سُرخ بندیا
مرا نام جپتی تھی
خوشبُو
گلابی لبادوں سے باہر نکل کر
مجھے سُونگھتی تھی
لبوں سے ٹپکتے ہُوئے بول
مصری کی ڈلیاں تھے

کانوں میں گھُل کر
مِرے تن کی شریانوں
ننھی رگوں تک کو
میٹھی تمازت سے مسحُور کرتے تھے

چاروں طرف
ریشمیں ڈوریاں، ندیاں
مجھ کو تھامے کھڑی تھیں

مِرے سامنے
ایک بانکا، سجل، تیز دریا تھا

دریا
جو ریشم کا دھاگا تھا
سوزن تھا
اپنے ہی دونوں کِناروں کو
پیہم رفو کر رہا تھا
زمیں کے اُدھڑتے ہُوئے چاک کو
سی رہا تھا!

عجب روشنی تھی!
مہکتے ہوئے سبز باغات
پنچھی
کسانوں کے گھر
کھیتیاں

میرے دامن پہ
گوٹے کناری کی صورت
دمکتی تھیں
مَیں ساری دھرتی کو
سینگوں پہ اپنے اُٹھائے
کھڑا تھا

مِرے دم سے
گندم کے خوشوں میں دانے تھے
اشجار بارِ ثمر سے جُھکے تھے
سفیدی کے دَھبّے

ہری گھاس میں چر رہے تھے
مَیں ہل کی انی تھا
درانتی کی کُبڑی زُباں تھا
اُگاتا تھا مَیں
خُود ہی پھر کاٹتا تھا
پُرانی سی اِک بیل گاڑی میں پھر
خُود کو مَیں لادتا تھا
سڑک بن کے
شہروں کے پھُولے ہُوئے پیٹ تک
رینگتا تھا
رگوں میں لہُو بن کے پھر
دوڑتا تھا
قلم کی انی
مُوقلم کی زباں سے
لرزتی ہُوئی اُنگلیوں کی کماں سے
شبیہ اِک بناتا تھا ایسی
کہ جو اصل پر خندہ زن تھی
مَیں دھاروں کا سنگم

گلوں کی روانی تھا
رنگوں کی سیّال حدّت میں
بھیگا پڑا تھا!

○

کبھی —— جب ہَوا
کالے مُردہ پہاڑوں سے
پلّو چھڑا کر
مری سمت آتی
تو رنگین فرغل پہنتی
دبے پاؤں چلتی
مِرے گھر کی چوکھٹ سے ٹکرا کے
رُکتی
شگوفوں سے، بچّوں سے
میرا پتہ پُوچھتی
اور مَیں
اپنی آنکھوں کے پَٹ بھیڑ کر
ہلکی ہلکی تھکاوٹ کی تہہ
اپنے سارے بدن پر جمائے
اُسے —— اُس کے قدموں کی

بڑھتی ہُوئی — اور گھٹتی ہُوئی چاپ سے
پاس آتے
پلٹ کر کہیں دُور جاتے ہُوئے
دیکھتا

ساری دُنیا
نہ سوئی پڑی تھی نہ بیدار تھی
اِک نشیلی سی، جادُو بھری اُونگھ
تینوں زمانوں پہ چھائی ہُوئی تھی۔

زمیں
آسماں

ابر پارے
پَروں میں سروں کو چھپائے ہُوئے
جَل کے پنچھی
کھجوروں کے سایے میں
نرجل کے باسی
بس اِک اُونگھ تھی
جو مری بند آنکھوں سے
صحرا کے ٹیلوں

تاروں کے بکھرے ہُوئے مخملوں تک
ہراِک شے کو
زردوزلوری کے
زرناب دھاگوں میں
جکڑے ہُوئی تھی !

○

سحر

روز، کمرے کی چھت کو ہٹاتی
مرے پاس آتی
مرے نرم بستر کی چادر بدلتی
مجھے، جیسے پر مار کر
گھر سے باہر نکلنے پہ
مجبور کرتی
یہ کہتی:
بہت سو لیے تم
اُٹھو
گھر سے باہر نکل کر بھی دیکھو
ہوا کیسی تازہ ہے
کومل ہے
اور دھوپ کے لمس میں
کتنا نشہ ہے

لذّت ہے
کب تک یُونہی
پوستی بن کے
بستر میں لیٹے رہو گے ؟

سحر

روز، ایسے ہی مکتی
مگر شام ہوتے ہی
کہتی :
بُہت تھک گئے ہو
چلو
اپنی آرام کرسی میں بیٹھو
اُتارو
یہ چمڑے کے
سُوکھے ہُوئے بُوٹ
دیکھو
یہ بالوں میں پھر
ڈینڈرف[1] آگیا ہے

---

[1] DANDRIFF

بُہت تھک گئے ہو
یوں ہی —— اپنی آرام کُرسی میں
لیٹے رہو
بس —— اسی طرح لیٹے رہو!

اور مَیں ——
اپنی آرام کرسی میں لیٹا ہُوا
آتے جاتے زمانوں کو تکتا تھا
اور اُونگھتا تھا
پھر اِک دن
مِرے دَر پہ دستک ہُوئی
اِک ہیولے نے
نیلے فلک سے اُتر کر
بڑے زور سے میرے شانے
ہلائے
ہلائے —— تو مَیں
شانگری لا کا باسی
ذرا کسمسایا
بکھرتی ہُوئی دُھند کے چاک سے
مَیں نے دیکھا

زمانے کا موسم بدلنے لگا تھا
گھنی کھیتیاں
سبز جنگل
کسانوں کے گھر
سب کو
کائی میں لپٹے ہوئے لجلجے کیکڑے
اپنے پنجوں میں لے کر کُترنے لگے تھے
ہرے، مدھ بھرے
میرے دونوں کنارے
سُلگنے لگے تھے
خُوشی
سر برہنہ، اکیلی، جواں
اک کنارے پہ روتی تھی
اور بین کرتی تھی
دُکھ
اپنا لشکر لیے
دُوسرے گھاٹ پر
خیمہ زن، شادماں

اور میں
دُکھ کی ننگی خُوشی
اور خُوشی کی سُلگتی ہُوئی پیڑ
کے درمیاں
اِک نشاں
جیسے لچھمن کی ریکھا
جسے پاؤں کی نوک چھُو لے
تو تاریخ کا رُخ بدلنے لگے!

○

تو — تاریخ کا رُخ
بدلنے لگا
وُہ دریا کہ اپنے کناروں کے اندر تھا
بادل کے بے رحم چابک
کی ضَربوں سے
پاگل ہُوا
تُند لہریں
دَمکتے ہُوئے صاف ماتھے کی
شکنیں بنیں
جست بھر بھر کے
دونوں کناروں کو
نگلنے کی کوشش سی کرنے لگیں
جَڑ سے اُکھڑے درختوں کے پنجر
پرندوں کے پَر
اور بچّوں کے نازک کھلونے

غضبناک، وحشت زدہ، تیز غرّاتی موجوں کے راکب بنے
ڈھور دھرتی سے کٹ کر
سب مچھلیاں بن کے رہنے لگے
اینٹ گارے سے دامن چھڑا کر
مکاں
کشتیاں بن کے بہنے لگے
سانپ پتوار، بچھو مسافر بنے
آدمی غرق ہونے لگے
ہر طرف چادرِ آب بچھتی گئی
پھر خموشی نے
ہر شے کو خاموش رہنے کی تلقین کی
اور زمیں چپ ہوئی
آسماں چپ ہوا
اور دریا
خود اپنے بدن سے لپٹ کر
سسکنے لگا
پھر وہ اپنے ہی مرکز کے
ٹیلے سے نیچے اتر کر

اُترتے ہُوئے پانیوں کے
سبز دائرے سے نکلنے لگا
اُس نے دیکھا
وُہ سارے نشیب
اور خالی کنوئیں
جن کے سینوں پہ بھاری قدم رکھ کے
اُس نے
اُفق کی بھڑکتی ہُوئی زرد جھالر کو
چھُونے کی کوشش سی کی تھی
وُہ سب
اُس کے سیّال تن سے
گھڑے ، کُوزے ، کشکول
لاکھوں جُگوں کی جلی خُشک مشکیں بھرے
ہنس رہے تھے
مگر اُس نے دیکھا
وُہ دریا نہیں تھے
فقط چھوٹے چھوٹے سے جوہڑ تھے
ٹھہرے ہوئے باسی پانی کے

اندھے گڑھے تھے
جھاڑوں، جڑی بُوٹیوں
سُوکھے گُنجان جھاڑوں سے
اَٹے پڑے تھے
اُسے یُوں لگا
جیسے پانی رواں ہو تو پانی ہے
ورنہ غلاظت سے لبریز
اندھا گڑھا ہے
فقط ایک اندھا گڑھا!

اور پھر ــــ یوں ہُوا
سرسراتی سی پرچھائیں
ہمراز کی
میری پیہم روانی پہ
برہم ہُوئی
میرے پیچھے
دبے پاؤں آنے لگی
ہر قدم پر مجھے
برف ہاتھوں سے چُھو کر
گزرنے لگی

ایک دن
بھاری بھرکم
ربڑ کے گھسے تیز پہیوں پہ بیٹھی
مجھے
اپنے لوہے کے جُبڑوں سے نابود کرنے کو آئی

مگر سوچ میں پڑ گئی
اُس نے اِک قرمزی پھُول
ہاتھوں میں میرے
تھمایا
رُکی
ایک شیشے کا نازک سا گُلدان بن کر
سڑک پر گری
ریزہ ریزہ ہُوئی!

دُوسری بار
اُونچے فلک سے
کِسی بھُوکے گِدھ کی طرح
اپنے گندے پروں کو سمیٹے
سیہ چونچ کھولے
وُہ اِک چیخ سی مار کر
مجُھ پہ جھپٹی
گِری
پھر مکانوں کے ملبے پہ اِک پل رُکی۔ رُک کے

تیزی سے آگے بڑھتی
مجھ کو کھا جانے والی، عجب
لال پیلی نگاہوں سے تکتی ہوئی!

تیسری بار
ساون کی اِک گنگناتی ہوئی
کالی شب میں
وُہ دُزدانہ آئی
مرے کھاٹ سے لگ کے تا دیر بیٹھی رہی
پھر اندھیرے میں
اُس کا بدن
مجھ سے ٹکرایا
طُوفان آیا
وُہ کُنڈلی سے باہر کو لپکی
چمکتی ہُوئی ایک ٹھوکر بنی
پھر نہ جانے اُسے کیا ہُوا
وُہ مُڑی
اور دہلیز کو پار کر کے
گھنی، گہری

جنگلی گلابوں کی اِک باڑ میں
گم ہوئی
اپنی ہی ذات میں
چھُپ گئی!

آخری بار
اُس نے مجھے
قہر آلود نظروں سے اِس طور گھورا
کہ مَیں آج تک
خوف کی کپکپی
اپنے سارے بدن میں رواں دیکھتا ہوں
مَیں پٹڑی پہ بیٹھا تھا
وُہ
اِک سیہ فام عفریت کے رُوپ میں
ساری دُنیا کو لرزاتی
پٹڑی کی چیخوں کے کہرام میں
ایک وحشت زدہ تیز سیٹی بجاتی
مِری سمت آئی
بس اِک لمحہ

جانے مجھے کس نے پٹڑی سے جیسے اُٹھا کر
ہَوا میں اُچھالا
نجانے وُہ کب
دِن سے
میرے لبادے کو چھُوتی ہُوئی
برق کے ایک کوندے کی صُورت
گزُرتی گئی
پھر اُفق کی سیاہی میں
دَھبّہ سا بنتی گئی
آخرش
مٹ گئی!

مٹ گئی
نیلے آکاش کا
آخری ابر پارہ بنی
اپنے اندر اُتر کر
فضاؤں میں تحلیل ہوتی گئی

اور مَیں
اپنے بوجھل پپوٹوں کے محبس سے
آزاد ہو کر
ہزاروں برس کی گھنی نیند سے
جیسے بیدار ہو کر
تحیّر میں ڈوبا
انوکھی چکا چوند کے
رُو بہ رُو آگیا
مَیں نے دیکھا کہ ہر چیز
خود اپنے ہونے کا اعلان تھی

اپنی خوشبُو کے اندر بسی تھی
خود اپنی ہی لَو سے منوّر تھی
چاروں طرف
قربُ کی موہنی دلکشی میں
حِنائی سا اِک دستِ نازک بنی
ہر کسی کو نظر آ رہی تھی

نظر آ رہی تھی
مگر ریت پر
"جانے والی" کے قدموں کے گہرے نشاں
اب بھی باقی تھے
بیمار کتوں کی آوازیں
بین کرتے تھے
روتے تھے
دریا مگر مطمئن تھا
گھسے تیز پہیّوں، پَروں
سیٹیوں کے
لگاتار حملوں سے
محفوظ

پانی کے بے نام دھاروں میں
ڈھلتا
سمندر کی تہہ میں
اُترنے لگا تھا
کسی طفلکِ گُم شُدہ کی طرح
ہاتھ پھیلائے
روتی ہُوئی مادرِ مہرباں کی طرف
جا رہا تھا
پہاڑوں کے دامن سے
اُدھڑے ہُوئے ساحلوں تک
وُہ ہردم سفر میں تھا
ہردم
رُکا بھی ہُوا تھا
سمندر کی جانب رواں تھا
مگر خوُد
سمندر کا پھیلا ہوا ایک بازُو بھی تھا
سب نے دیکھا
پہاڑوں کے شانوں پہ

اِک ہاتھ رکھے
وُہ اپنی ہی سوچوں میں
گُم
اِک فروزاں سے لمحے میں
ڈُوبا ہُوا
کِس قدر شانت
کِتنا بڑا ہو گیا تھا!!

سمندر

○

وُہ چھن بھر میں
کتنا بڑا ہو گیا تھا!
اُچھلتے ہُوئے شوخ جھرنے
جواں ندّیاں
سُست دریا
سبھی دست و بازو تھے اُس کے
مہک اُس کی
کھیتوں، گھنے جنگلوں
سبز چوغوں میں ملبوس ٹیلوں
دھڑکتے مکانوں
چمکتے ہُوئے تازہ جسموں میں
پھیلی ہُوئی تھی
وُہ تارے کی لَو میں لرزتا تھا
آنسُو کی بھیگی ڈلک میں نہاں تھا
فلک

اُس کے شفّاف سے آئینے میں عیاں تھا
جھمکتی جھلکتی ہُوئی مچھلیاں
اُس کی پایاب لہروں میں
ہردم اُسے ڈھونڈتی تھیں
اُسے اپنے سینوں سے چمٹائے
پھرتی تھیں
اُس کے لیے
کیسی پاگل ہُوئی تھیں!

وہاں ___ جس جگہ آج
ایک صحرا بچھا ہے
کبھی، صدیوں پہلے
وہاں بڑ کا اِک پیڑ رہتا تھا
ہر روز ___ مَیں
آگے بڑھ کر
چرن اُس کے چھُوتا
وُہ ہر روز مجھ کو اُٹھا کر
گلے سے لگاتا
یہ کہتا!
مجھے اپنے تن سے جُدا مانتے ہو؟
سُنو!
مَیں کوئی خشک بے برگ پنجر نہیں ہوں
جسے تم اُٹھانے کو ہر روز آؤ
مَیں زندہ ہوں
ہر دم تمہیں

اپنی شاخوں، جڑوں
سبز پتّوں میں
نیلے سمندر کی صُورت!
رواں دیکھتا ہوں
مگر تم تو کچھ جانتے ہی نہیں ہو ——"

وُہ ہر روز مجھ سے یہ کہتا
مگر مَیں تلاطم تھا
اپنی ہی آواز میں گم
مجھے بڑ کی باتیں
فقط ایک مجذوب کی بڑ لگی تھیں
وُہ بڑ
کب کا صحرا کے سینے میں گم ہو چکا ہے
مگر آج مَیں جانتا ہوں
وُہ میری ہی تصویر تھا
میرا اوتار تھا
میرا چہرہ تھا وُہ
مَیں نے خود اُس کو بھیجا تھا
اپنی طرف
اُسے خود بُلایا تھا اپنی طرف!

اور پھر ——— یوں ہُوا
مَیں نے اِک بار پھر
بُڑ کا بہروپ بدلا
خُود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر
وہاں، جس جگہ اب سے پہلے
خُنک ریت کا ایک صحرا بچھا تھا
مَیں پتّوں کا اِک تاج
سر پہ سجائے
کھڑا ہو گیا
پھر مَیں
اپنے ہی چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں
اپنی ہی ریشِ مُبارک کے سایے میں
دھرتی کی مسند پہ
تشریف فرما ہُوا
آلتی پالتی مار کر

ایسے بیٹھا کہ جیسے ازل سے
یہی میرا مسکن تھا
آنکھوں کو میچے
مَیں اپنے ہی محور پہ
گردش سی کرنے لگا
اپنے "ہونے" کے ٹُوٹے ہُوئے آئینے میں
خُود اپنے ہی منظر کو
تکنے لگا!

○

میں نے دیکھا
ہوا ـــــ ہر جگہ تھی
مگر جب ہلاؤ
تو بیدار ہوتی
ہر اک شے کو بیدار کرتی
سجل اوس کی کرچیوں کو
زمیں پر گراتی
پرندوں کو
اُوپر کی جانب اُڑاتی
"یہاں" کو "وہاں" سے جُدا کر کے
لمبی مُسافت کا منظر دکھاتی
حسیں بادباں اپنے سینے پھُلائے
کنارے اُسے اپنی جانب بُلاتے
وہ چلتی تو لگتا
کڑے کوس

جھانجھن سی بن کر چھکنے لگے ہیں
ہر اِک شے
خُود اپنی جُدائی کا نوحہ بنی ہے
لرزتی ہُوئی گھنٹیوں کی صدا
مُشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز
کالے بادل کی بوجھل خوشی
رعد کی چیخ
بھاری لبادوں کے نیچے
گُھٹے تنگ سینوں کے ساگر میں
بِپھری ہُوئی شارکیں، خواہشیں
سارا منظر
ہَوا کے سفر کا کرشمہ تھا
ہر فاصلہ اُس کی کروٹ سے
پُھوٹتا تھا
وُہ
ہر جگہ تھی
مگر اُس کے ہونے نہ ہونے میں

اِک سرسراہٹ کا پردہ سا
حائل تھا
سب فاصلے
نرم ریشے تھے
اُس کے بدن سے نکل کر
سمندر کی چھاتی
بیاباں کی ریگِ رواں پر بچھے تھے
لرزتے ہُوئے
لاکھوں مکڑی کے باریک دھاگے بنے تھے!

کبھی ـــــ دن ڈھلے جب
ہَوا
تازیانے کی صُورت
سمندر پہ گرتی
تو سینے کے زنداں میں
دبکی ہُوئی موج
باہر کی جانب اچھلتی
پہاڑوں سے ٹکرا کے

بپھرے ہُوئے تُند دھاروں کی صُورت
زمیں کی ہتھیلی پہ آوارہ پھرتی
ہتھیلی پہ ریکھائیں بن کر چمکتی
پلٹ کر
زمیں کی لرزتی ہُوئی اوک سے
قطرہ قطرہ
سمندر کے مُنہ میں اُترتی

سدا دائروں میں
سفر کے مراحل کا منظر دکھاتی
دلوں کو لُبھاتی!

معاً

مَیں نے دیکھا
زمیں پر ہَوا تھی
ہَوا کے تڑختے ہُوئے فاصلے تھے
مگر سبز دھرتی کی
ٹھنڈی تہوں میں
جڑوں کی پُراسرار وحدت تھی
سب فاصلے
ایک نقطے میں سمٹے ہُوئے تھے
ہزاروں جڑیں
ایک ہی جڑ سے پھُوٹی تھیں
آگے بڑھی تھیں
مگر جڑ سے ایسی جُڑی تھیں

کہ چلنے کے عالم میں
ٹھہری ہُوئی تھیں
یہ ساری جڑیں
سبز دھرتی کی اپنی جڑی تھیں
جو خود اُس کے گیلے بدن میں
اُترتی گئی تھیں

کہو کون تھا وُہ ؟
کہ جس نے کہا تھا :
ستارے فقط پات ہیں
کہکشائیں
گندھی نرم شاخیں ہیں
آکاش
اک سبز چھتنار
ہر شے پہ سایہ کُناں ہے
مگر اس کی جڑ
اس کے اپنے بدن میں

نہیں ہے!

کہو کون تھا وُہ
کہ جس نے ہوا کی حسیں سرسراہٹ
لرزتی ہُوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا
مُشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز
اور خواہشوں کے تلاطم کو
دُکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟
وُہ جس نے
خُود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو
اپنی جڑوں کو
فریبی، سیہ کار، جھُوٹا کہا تھا؟

مرا اُس سے
کوئی تعارف نہیں ہے
مجھے تو فقط
اپنے "ہونے" کا عرفان ہے
مَیں تو بس اس قدر جانتا ہوں

پَروں کو ہلاتی
حسیں قوس بن کر
مری سمت آتی ہُوئی
فاختہ
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پُورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
تیرگی کی گپھا سے نکلتا ہُوا
روشنی کا جہاں
دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن
بھیگی پلکوں پہ دُکھ کی تپکتی چُبھن
سبز شِیدوں کی بہتی ہُوئی آب جُو
اِک انوکھے پُراسرار معنیٰ کے
گھاؤ سے رِستا لہو

مُسکراتے ہُوئے لب

یہ سب

میرے اوتار ہیں
میری آنکھیں ہیں
مُجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں
سدا مُجھ کو تکتی رہیں گی !!

گھاس میں تتلیاں

رات بھیگے گی تو ہر تارا چبھن بن جائے گا
رفتہ رفتہ خوں میں تر شب کی قبا ہو جائے گی

ترتیب

پیش لفظ	وزیر آغا	۱۹۷۹	۶۱۷
جزیرے		۱۹۷۹	۶۱۹
ساون کا آخری دن		۱۹۷۹	۶۲۲
مچھ ریکھا		۱۹۷۹	۶۲۵
وہ اک آبی پرندہ		۱۹۷۹	۶۲۷
بارش کے بعد		۱۹۷۹	۶۲۸
سانپ پر پاؤں آجانے کے بعد		۱۹۷۹	۶۳۰
تماشہ		۱۹۸۰	۶۳۲
کون اُس کو روک سکتا ہے		۱۹۸۱	۶۳۴
شام		۱۹۸۱	۶۳۷
درانتی رقص کرتی ہے		۱۹۸۱	۶۳۹
آزادی		۱۹۸۱	۶۴۱

پوسٹ مارٹم	۱۹۸۱	۶۴۴
ٹرمینس	۱۹۸۲	۶۴۷
مجھے خزاں نے بہت ڈرایا	۱۹۸۲	۶۶۰
بیوگی	۱۹۸۲	۶۶۲
سنجوگ	۱۹۸۳	۶۶۵
الاؤ	۱۹۸۳	۶۶۷
دستک	۱۹۸۴	۶۷۴
صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے	۱۹۸۴	۶۷۶
اندر کے رونے کی آواز	۱۹۸۴	۶۷۸

پیش لفظ

ایک اور انیک کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ بعض لوگ انگنت چہروں میں صرف ایک چہرے کے نقوش تلاش کرتے ہیں اور اگر مقدر یاوری کرے تو اپنی سعی میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر بعض لوگ ایک چہرے میں انیک چہروں کے خدوخال دیکھ لیتے ہیں۔ اور یوں ساری زندگی عالمِ حیرت میں بسر کرتے ہیں۔ تخلیق کار اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مگر تخلیق کار بھی کئی طرح کے ہیں۔ بعض سورج کی طرح روشنی کا ایک بہت بڑا منبع ہوتے ہیں۔ وہ دانش کی شعاعوں کو چہار اکناف میں پھیلانے پر قادر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی انہیں ننگی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ اگر دیکھے تو بینائی سے محروم ہو جائے ——— بعض تخلیق کار چاند کی طرح بھیگی ہوئی روشنی پھیلاتے ہیں۔ یہ روشنی اندھیرے سے متصادم نہیں ہوتی بلکہ اس میں حل ہو کر چاندنی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور ہزاروں لاکھوں کہانیوں کو جنم دے ڈالتی ہے۔ ان کے علاوہ بعض تخلیق کار ایسے بھی ہیں جو زندگی بھر موم بتی کی طرح نور کے ایک مختصر سے دائرے کے اندر ہی سلگتے رہتے ہیں۔ شاعر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

سو شعر کہنا موم بتی کی طرح دھیرے دھیرے سلگنے کا عمل ہے۔ مگر موم بتی کی روشنی سورج کی شعاع کی طرح خطِ مستقیم پر سفر نہیں کرتی۔ بلکہ ایک شمع کی نوک سے چھلانگ لگا کر دوسری اور پھر تیسری تک پہنچتی ہے اور تب یہ جلتی ہوئی شمعیں دائرہ در دائرہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے پھر غروب ہو جاتا ہے۔ چاند ابھرتا ہے پھر ڈوب جاتا ہے مگر یہ ننھی منّی سی شمعیں سدا سلگتی رہتی ہیں۔ شاعری کا حلقۂ اثر اسی لیے زیادہ ہے کہ شاعری نور کے دائرے تخلیق کرتی ہے اور پھر ان دائروں کے اندر تا قیامت سلگنے کا اہتمام کرتی ہے۔

میری کہانی یہ ہے کہ مَیں نے تنقیدی کتب بھی لکھی ہیں، لاتعداد موضوعات پر مقالے بھی سپردِ قلم کیے ہیں اور بقول شخصے انشائیوں کے ڈھیر بھی لگائے ہیں مگر ان کے علاوہ مَیں نے ایک ننھی سی موم بتی بھی سلگائی ہے اور یہ موم بتی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے کہ اس کا تعلق میرے شعری باطن سے بہت گہرا ہے۔ اس موم بتی کی نوک پر جو روشنی اُگی ہے اُس نے باہر کی طرف تو ایک دائرہ نور بنایا ہے جو دیکھنے والوں کو نظر آ سکتا ہے مگر اس کے نور کا اصل دائرہ وُہ ہے جو شاعر کی ذات کے اندر نمودار ہُوا ہے اور جس نے اُسے سیاحتِ قلب کا شیریں ذائقہ عطا کیا ہے۔ اگر اس عمل سے کچھ اور موم بتیاں گھاس پر رقص کرتی ہُوئی تتلیوں کی طرح کَو دینے لگیں۔ تو میرے لیے یہ سعادت ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ میرے لیے یہی بہت ہے کہ روشنی کے اس دائرے میں قلعہ بند ہو کر مَیں نے اپنے اندر کی سیاحت تو کی ہے۔ اور اس سیاحت میں وہ کچھ حاصل کیا ہے جو باہر کی دُنیا میں سفر کرنے والے کسی بھی مارکو پولو یا کولمبس کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے میری شاعری کے ایک نقّاد نے (جو اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں) اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ مَیں عمر بھر شاعری سے کیوں چمٹا رہا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو مَیں انہیں بتاتا کہ شاعری نے میرے اندر روشنی پھیلائی ہے۔ اور اگر مجھے شعر کہنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی تو مَیں کسی بھی صنفِ ادب میں کچھ نہ کر سکتا۔ شاعری میرے لیے رُوح کی غذا ہے اور مَیں نے اسکی فراہم کردہ قوّت سے خود کو زندہ رکھا ہے۔ رہی یہ بات کہ خود اس شاعری میں زندہ رہنے کی سکت کس قدر ہے تو اس کے لیے پہلے عصر کو عبُور کرنا شاید ضروری قرار پائے۔ سو مَیں راضی برضا ہوں۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ مَیں نے آج سے چالیس برس پہلے جو موم بتی جلائی تھی وہ ابھی تک ہولے ہولے سُلگ رہی ہے۔

وزیر آغا

جزیرے!

سمندر

دودھیا پانی کا اک میٹھا سمندر!
پُرانے سال خوردہ گیت تازہ لے میں گاتا ہے
ہَواؤں کو جگاتا ہے
قدم آگے بڑھا کر
ریگِ ساحل پر کروڑوں سال پہلے کے نقوشِ پا کو تکتا ہے
ذرا — آگے کو جُھکتا ہے
نقوشِ پا کو گیلے ہاتھ کی مٹھی میں لے کر
اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے

دمکتے ابر پارے
اُس کے ہونٹوں سے ٹپکتے نرم بوسے ہیں
ہَواؤں کے جوان قاصد جنہیں لے کر بکھرتے ہیں
پہاڑوں، جنگلوں، بے آب صحراؤں میں پھرتے ہیں

اُنہیں آواز دیتے ہیں جو ماں کی گود سے نکلے
مگر اب تک نہیں لوٹے
"یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں
یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں" ——
مگر آواز پر لبیک کوئی بھی نہیں کہتا
ہمیں تو ماں کے خدّ و خال تک بھی یاد کیا ہوں گے
ہمیں تو ماں کے ہونے کی خبر تک بھی نہیں شاید
کہ ہم ہجرت کے دن سے آج تک
اپنے ہی جسموں کی گھنی خوشبو میں لپٹے
خوف کی وادی میں بیٹھے ہیں

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
فلک سے قطرہ قطرہ اوس کی برکھا اُترتی ہے
کبھی جب پیاس کی شدّت سے زخمی ہونٹ
بہتی تیز ندّی کے سجل سینے پہ جھکتے ہیں
کبھی جب آنکھ رِستی ہے
تو یوں لگتا ہے جیسے ہم کبھی بچھڑے نہیں اُس سے
کہ جیسے ہم —— جزیرے ہیں

تھپکتے لوریاں دیتے سمندر کے بدن سے ہم
بلکتے، زرد رُو، بیمار بچّوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں
ہماری ہجرتوں کی داستاں جھوٹا فسانہ ہے!!

ساون کا آخری دن!

ساون! تیری بھیگی پلکیں
جھکی ہوئی، اچھی لگتی ہیں
ٹپ ٹپ گرتی ننھی بوندیں
شب بھر، ٹین کی ٹھنڈی چھت پر
نازک سی پوروں سے
ٹائپ کرتی ہوئی، اچھی لگتی ہیں
گئے دنوں کے نام
معطّر خط لکھتی، اچھی لگتی ہیں
چھت کے نیلے کاغذ کے نیچے میں خود بھی
جیسے اِک میلا سا کورا کاغذ ہوں
میرے بدن پر
پوروں کی میٹھی ضربوں سے
لفظوں کے سائے اُترتے ہیں

خط کے سارے شبد مجھے پہچان گئے ہیں

کیا لکھّا ہے ؟
کیا جانوں مَیں کیا لکھّا ہے ؟
کون سی ایسی انہونی سی بات تھی جس نے
برسوں پہلے
"نہ کہنے" کے پلّو سے خود کو باندھا تھا
اور پھر دل کی ڈولی میں محبوس ہوئی تھی
اتنے لمبے، بوجھل سالوں خود سے بھی وہ چھُپی رہی تھی
آج اُسے کس مجبوری نے
لفظوں کے لب چھُو لینے پر اُکسایا ہے
گئے دنوں کے نام یہ نامہ لکھوایا ہے ؟

ساون کا یہ آخری دن ہے
کل جب بھادوں آجائے گا
ٹین کی چھت پر اپنے اُجلے پَر پھیلاتا
آنے والی سُرخ رُتوں کے
خوابوں میں جب کھو جائے گا
سب آوازیں تھم جائیں گی

پلکیں تھک کر سو جائیں گی
گئے دنوں کا نام
منوں مٹّی کے نیچے دب جائے گا
اگلا ساون کب آئے گا!؟

مچھ ریکھا

مُٹّھی کھولو
دیکھو ہاتھ کی ریکھاؤں میں کس ریکھا نے دَم توڑا ہے ؟
کس نے رستہ بدل لیا ہے ؟
کس کا رستہ کون سی ریکھا کاٹ گئی ہے ؟
مچھ ریکھا کی بات سناؤ
مچھ ریکھا موجود ہے یا وہ شام کی جھیل کے پار گئی ہے ؟

گہری جھیل تمہاری آنکھیں
ان آنکھوں میں ننّھے مُنّے چڑیوں ایسے خواب آئے تھے
تنکا تنکا جوڑ کے تم نے
جھیل کنارے
کیسے سُندر محل اُسارے
اور پرُانے گھر ڈھائے تھے !

کلر کہار کے گوُنگے باغ کے نیلے مور بھی اب غائب ہیں
چڑیوں کی لہراتی ڈاریں

فرشِ زمیں کی اُٹھتی دبتی ہر سلوٹ کو روند گئی ہیں
دودھیا بگلوں کے چھینٹے سے
ہر سُو، کالے کھیتوں کے ٹھہرے پانی پر
آن گرے ہیں
پھلبہری کے داغ بدن پر پھیل گئے ہیں

مُٹھّی کے پَٹ مت کھولو تُم
ریکھائیں چڑیاں ہیں اُڑ جائیں گی ساری
اور تم خالی پیڑ کی صورت رہ جاؤ گے[۱]!

---

[۱] اپنے ایک عزیز کے اکلوتے بیٹے کی مرگِ ناگہاں پر

وُہ اِک آبی پرندہ!

مسرّت —— جیسے اِک آبی پرندہ ہے
گلے میں سُرخ اور نیلا ربن
پنجوں میں جھانجھن
اور پَروں پر آسمانی پینگ کی ساتوں لکیریں
ڈُوبتے سُورج کے رنگیں بادباں سے اُڑ کے
کالی رات کے مُردہ سمندر پر اُترتا ہے
سمندر کے سیہ، گونگے لبوں پر
دمکتی مُسکراہٹ کی کرن بن کر چمکتا ہے
سُنہری شوخ مچھلی کی طرح
اپنے ہی رنگیں دائرے میں
جیسے چھِن بھر کے لیے آرام کرتا ہے
معاً اپنے پَروں کو پھَڑپھڑا کر تیر کے مانند اُٹھتا ہے
کہاں جاتا ہے؟ —— کوئی کیا بتائے کون سی دُنیا کو جاتا ہے!
مگر میرے بدن پر
اُس کے پنجوں کا نشاں
اِک زخم ہے —— جو دیر تک مجھ کو جلاتا ہے
مجھے —— شاید مجھے جینا سکھاتا ہے!!

بارش کے بعد!

صبح چھینٹا پڑا
خشک دھرتی ہنسی
کھیتیاں دلہنوں کی طرح گنگنائیں
ہمیں آتے دیکھا تو اتنا لجائیں کہ پتّوں کے گھونگھٹ میں چھپنے لگیں
سرافراز لہراتے گنّے کے کھیتوں نے
سہروں کی درزوں سے جھانکا ہمیں
اور شکووں کے تیوروں سے
چھلنی کیا دیر سے آنے والے سبھی دوستوں کو
براتی — پرندے، ہوا، بادلوں کے سبکبار گھوڑے
بزرگوں میں سورج، درختوں میں برگد، پرندوں میں گدھ
سب نے مل جُل کے، آتے زمانوں کی خاطر
ہمارا سواگت کیا
زرد مینڈک، وہ اُجلے مغنّی کہ جن کے گلے
تیز شہنائیاں!

ہر طرف سے
"بدھائی" ! "بدھائی" ! کی اُونچی صداؤں میں ہونے لگے نغمہ زن
اور طوطوں کی ڈاریں ہمارے سروں پر سے طیارہ صورت گزرنے لگیں
نرم خوشبو بھرے شوخ گجروں میں ڈھلنے لگیں

یہ سہروں کی درزوں سے تکتا ہُوا ایک پُورا جہاں
نگاہوں میں آتے زمانوں کا گھونگھٹ اٹھانے کی خواہش نہاں
اُفق کے لہُو رنگ قالین پر
آسماں اور زمیں کا مِلن
جیسے ہونٹوں کے مِلتے کنارے، کناروں کا خم
یہ مرنے سے پہلے نئی زندگی کا سواگت
خود اپنے بدن کی سیہ راکھ سے
ایک شعلے کی صُورت اُبھرنے کی پیاسی لگن
کیسی خواہش ہے یہ
جس کے صد رنگ محبس میں ہم۔ بے زماں
بے نشاں ___ کل بھی تھے
آنے والی رُتوں میں بھی ہوں گے یونہی بے نشاں !!

سانپ پر پاؤں آجانے کے بعد

ٹپ سے آنسو گرا، چھَن
کی آواز آئی
کہا اُس نے: سجدے[1]!
خدارا اسے تم بجھاؤ نہیں
اب اسے تو بجھاؤ نہیں!
مَیں نے نظریں اُٹھا کر اندھیرے کو گھُورا
تو اُس کے سیہ بطن میں بھی رمق جاگتی تھی
رمق — جو کھُلی آنکھ کا مرکزہ تھی
رمق — جس کے محور پہ گہرے اندھیرے کی
لاکھوں سلیں گھُومتی تھیں
جس کا ایندھن تھیں، سُوکھی ہُوئی ہڈّیاں، خواہشیں
تتلیاں!
رمق — جو چمکتی ہُوئی آنکھ بن کر
مجھے گھُورتی تھی!

مجھے گھُورتی تھی کہ مَیں

---

[1] ممتاز مفتی کے افسانہ "آپا" کا مرکزی کردار

خُشک لکڑی کا کاغذ سے باریک چھلکا
خود اپنے ہی محور پہ چکراتا، مُڑتا
کھُلی آنکھ کے گرم تنّور میں گر رہا تھا
مَیں گرتا چلا جا رہا تھا!

مَیں گرتا چلا جا رہا تھا کہ ٹھوکر لگی
ٹپ سے آنسو گرا
چھَن کی آواز آئی
رمق بجھ گئی
مَیں کہ خود کو سدا
خشک ایندھن سمجھتا رہا تھا
مجھے کیا خبر تھی کہ مَیں ایک آنسو کا قطرہ ہوں
گہرے اندھیرے کے مارِ سیہ کی
دہکتی ہوئی زہر آلود چشمِ فسوں کو بجھانے میں
میرا بھی حصّہ رہا ہے!!

تماشہ!

سانجھ سویرے
گلی کی سُوجی آنکھوں میں
مشکیزہ چھینٹے مار گیا!

پھر جھاڑو، گھونگھٹ کاڑھے، چھاگل پہنے
آیا
رُک رُک چلتا
رات کی بکھری، پھٹی پُرانی تصویروں کو
نیلی پیلی تحریروں کو
جیب میں بھر کر
گلی کی گندی خندق کے اُس پار گیا!

پھر دروازے کی اوٹ سے سائیکل
کھڑ کھڑ کرتا، مونچھیں پُونچھتا

باہر آیا
اور گیا!

پھر اک کالا میلا برقع
ننھے سے اک نیر بہاتے بلسنے کو
بازو سے پکڑے
گلی کے باہر، کھڑے ہوئے تانگے کی اور گیا!

پھر اک حُقّہ
صدیوں پُرانا باسی حُقّہ
میلا سا اک پھٹا ہوا اخبار اُٹھائے
دُھواں اُگلتا
بُڑ بُڑ کرتا
دھیرے دھیرے تھڑے پر آیا
زور سے کھانسا
ٹھوکر کھائی
سنبھلا
کھاٹ بچھائی، بیٹھا
اور پھر یک دم لیٹ گیا!!

کون اُس کو روک سکتا ہے!

زمیں پر جھاڑیاں
خیمے لگائے
منتظر بیٹھی ہیں
اُس جھونکے کی ـــــ جو اک روز
پژُمردہ پہاڑوں سے اُتر کر آئے گا
خیموں کے پردوں کو
لرزتی انگلیوں سے چھُو کے دیکھے گا
بڑے ہی پیار سے سہلائے گا
اور نیند سے ناآشنا
خیموں کے پردوں کے عقب سے جھانکتی آنکھیں
اُسے حیرت سے دیکھیں گی
پھر اک آنسو بھری نازک سی سرگوشی اُسے
آواز دے گی
اور کہے گی!
آ، خدارا آ
مجھے میرے بدن کے اس جہنم سے رہائی دے

مجھے آزاد کر مجھ سے!

مگر جھونکا کہ اک صحرائی بدّو ہے
کبھی خیموں کی جانب چور قدموں سے نہیں آتا
دہکتی سُرخ آنکھوں
تیز لانبی برچھیوں سے لیس ہو کر
اک سیہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے لپٹا
وُہ آتا ہے —— تو دھرتی کانپ اُٹھتی ہے
پرندے پھڑ پھڑا کر آسماں کی سمت اُڑتے ہیں
دبک جاتے ہیں غرّاتے ہُوئے کُتّے
طنابیں ٹوٹتی ہیں
لفظ مرتے ہیں
ہزاروں ساعتوں میں —— وقت
کٹ کٹ کر بکھرتا ہے
سُموں کی ضرب سے
خیموں کی ساری دھجّیاں
چاروں طرف اُڑ اُڑ کے گرتی ہیں
خزاں میں جس طرح
شاخوں سے پیلے پات گرتے ہیں

چمکتی ریت پر
چاروں طرف خیمے ہی خیمے ہیں
مکینوں سے کہو
پردوں سے مت جھانکیں
کہو پردوں سے لگ کر
یوں کھڑے رہنے کا آخر فائدہ کیا ہے
اُسے آنا ہُوا
تو کون اُس کو روک سکتا ہے ؟

شام

شام، تری مہکار عجب ہے!
دُور افق سے آنے والا
ہر آوارہ حال پرندہ
تیری نازک شاخوں، مخمل پتّوں کی خواہش میں
کتنا ظالم کس درجہ خونخوار ہُوا ہے!
شام، پرندوں کی ڈاروں سے لڑتے لڑتے
تیرا بھی کیا حال ہُوا ہے!

شام اگر تُو دُلہن ہوتی
چمکیلی زربفت کی ساڑھی تجھ پر سجتی
پات، وداع کے گیت سُناتے
اور ہوا شہنائی بنتی
سارے دُکھ اور سارے سُکھ
باراتی ہوتے
سُورج کے پلّو سے بندھ کر
تُو جانے کس دُور نگر کی جانب جاتی

شبنم ایسے آنسو بوتی
شام، اگر تو دُلہن ہوتی!

شام، ترا کیا حال ہُوا ہے!
ہر اک تجھ پر جھپٹ رہا ہے
ہر شے تجھ کو نوچ رہی ہے
تارے، اپنے پنجوں سے
اور پنچھی، اپنی چونچوں سے
اور سُورج، اپنے بھالوں سے
اور انساں؟
وہ بے چارہ، اک ازلی بنجارہ
خود تیرا بہروپ بنا ہے
اپنے لہُولہان بدن کو
تیری قبا سے ڈھانپ رہا ہے
تیری طرح، وہ خود بھی تھر تھر کانپ رہا ہے!!

درانتی رقص کرتی ہے!

درانتی رقص کرتی ہے
زمیں پر گنگناتے انگنت خوشوں کے بادل میں
درانتی کوندتی پھرتی ہے

ہر خوشے کا بوسہ لے کے کہتی ہے:
"تمہاری، بس تمہاری منتظر تھی مَیں"
اُسے سینے سے چمٹاتی ہے
جھُولے میں جھُلاتی ہے
اُسے میٹھی سی اک لوری سُناتی ہے!

درانتی رقص کرتی ہے
کبھی گھنگھرو، کبھی مُدرا
کبھی جُھک کر، کبھی اک دائرے میں
گھُوم کر
چاروں طرف سو بار پھرتی ہے

درانتی

اک ہراساں فصل سے دامن چھڑا کر
دوسری تک
ایک جُگ کو پار کر کے
دوسرے جُگ تک
درانتی ـــــ خون کی پیاسی
درانتی ـــــ ناچتی !
بھُوری زمیں پر صورتِ تلوار پھرتی ہے
درانتی رقص کرتی ہے !!

آزادی!

خموشی
مُنہ پھُلائے
دھوپ سے آکر کھاٹ پر لیٹی تو چڑیا
ہنس پڑی، چھت سے
اُتر کر
کھاٹ کے پایے پہ آ بیٹھی
کہا!
بی بی! کسی نے کچھُ کہا تجھُ سے؟
تجھُے بابا نے ڈانٹا؟
ماں نے کوئی سرزنش کی؟
یا ——— بڑے بھیّا نے جھڑکا؟
کچھُ بتا بھی نا!

خموشی
مُنہ پھُلائے
کھاٹ پر تا دیر گُم صُم

جھولتے، مژگاں کے زینے سے
اُترتے آنسوؤں کو
غور سے تکتی رہی
آخر دوپٹے سے
بلکتے آنسوؤں کو پُونچھ کر

بولی:
تُو چڑیا ہے
تُو آزادی ہے
جب چاہے کھُلی کھڑکی سے، روشندان سے
دیوار کے روزن سے پھُر کر کے
منوّر آسمانوں
سبز کھیتوں، وادیوں
نیلے پہاڑوں، جنگلوں میں گھُوم سکتی ہے
تُو جب چاہے

جہاں چاہے ———
مگر تجھ کو خبر شاید نہیں ہے
مرے چاروں طرف
بے نُور آنکھوں
اَن کہے بولوں کی دیواریں

کھڑی ہیں
مرے چاروں طرف مجھ کو ڈراتی ......

چہک کر ننھی چڑیا نے
خموشی کی لرزتی بات کاٹی
اور پھُدک کر دُوسرے پایے پہ آ بیٹھی
کہا:
بی بی! مرے پَر ہیں
یہ پَر میرے محافظ ہیں
مَیں جاتی ہُوں
مگر واپس بھی آتی ہُوں
حصارِ عافیت سے تُو اگر باہر
کبھی باہر گئی تو کون جانے
کتنی آوازوں کے پنجے
تجُھ پہ جھپٹیں
اور ترے ملبوس کے پُرزے اُڑیں
پھر کون جانے
واپسی کا راستہ تجُھ کو ملے
یا نا ملے!

پوسٹ مارٹم!

کہاں ہوں؟
یہ چٹیل زمیں
جس پہ میلوں کے میلے نشاں
جیسے رکیلوں کی صورت گڑے ہیں
درختوں کے ہیکل
عمارات کی ہڈیاں
خشک ندیوں میں
کہنہ چٹانوں کے اعضا،
جلی کھیتیوں کے بدن
اور پرندوں کے جھلسے ہوئے پَر
کوئی ایک بھی چیز
زندہ نہیں ہے
زمیں مر چکی ہے!

زمیں مر چکی ہے تو کیا ہے؟
مجھے اُس کے مرنے کا دُکھ کس لیے ہو

اُسے ۔۔۔ اک نہ اک دن تو مرنا تھا، سو
مر گئی ہے!
مجھے دُکھ اگر ہے تو اس بات کا ہے
کہ جب وہ مری
آسماں نے اُسے
اِک لحد تک نہ دی
(شبنم افشانیاں تو بڑی بات ہے)
آسماں نے فقط یہ کیا
ایک سفاک سے ڈاکٹر کی طرح
اُس کی اکڑی ہوئی لاش کو
اپنے نشتر سے دو نیم کر کے
بدن کے خزانوں کو باہر نکالا
بکھیرا، ٹٹولا
لکھا: موت ۔ صدمے،
کسی ذہنی صدمے سے واقع ہوئی ہے!
پھر اُس نے
زمیں کی کٹی اور پھٹی لاش کو
یُوں ہی رہنے دیا
اور خود چل دیا!

جب سے اب تک

یہ چٹیل زمیں

اک دریدہ بدن بے ردا لاش ہے

اک دریدہ بدن بے ردا لاش ہے!!

ٹرمینس!

وہاں — کچھ نہیں تھا
بس اِک ننھا مُنّا سا چوکور
لوہے کا کمرہ
جو دفتر، رہائش، ٹکٹ گھر
سبھی کچھ تھا
کمرے کے باہر، نظر کی مُسافت پہ
اِک سُرخ سگنل تھا
اور سُرخ سگنل کے نیچے
سیہ، ریل کی لائنیں
اِک پہاڑی کے سینے سے ٹکرا کے
رُک سی گئی تھیں
ہزاروں برس سے
وہیں — چھنّی کھچّی[1] کے قدموں میں
بے حس پڑی تھیں!

---

[1] کسی زمانے میں چنیوٹ کے قریب دریائے چناب پر پُل نہیں تھا اور ریل دریا تک جا کر آخری اسٹیشن چھنّی کھچّی پر رُک جاتی تھی۔ بعد ازاں جب پُل بن گیا تو ریل نے دریا کو عبور کر لیا۔ اور چھنّی کھچّی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

سُنا ہے
یہی بس سُنا ہے کہ جب
شام ڈھلتی
ہَوا تیز چلتی
مکاتب میں چھُٹی کا اعلان ہوتا
مدرّس کی دستار
کھونٹی سے نیچے اُترتی
سیہ ناگ بن کر
خزانے پہ کُنڈلی سی اک مار کر بیٹھتی
اور حکمت کا، علم و ہُنر کا خزانہ
چھڑی کے سہارے کھڑا ہو کے
چاندی کے برتن کی صُورت کھنکتا
تو ہم —— زرد بچّے
کسی آنے والے زمانے کے سکّے
لڑھکتے ہوئے، اپنے قصبے کی گلیوں میں چاروں طرف
پھیل جاتے
ہمارے حَسیں گھر
تجوری کی صُورت، ہمیں
اپنی جانب بُلاتے

مگر ہم تجوری کے سکّے نہیں تھے
ہمیں تو زمانے کی گردش میں
خود اپنی قیمت کا اعلان کرنا تھا
اپنی پُراسرار ٹھنڈی چمک میں، ہمیں
لاکھوں پوروں سے مَس ہو کے چلنا تھا
ہم چل رہے تھے !

سو جب رات ڈھلتی
ہَوا تیز چلتی
تو ہم اپنے بابا سے کہتے:
ہمیں بھی کبھی چھنّی کھچّی سٹیشن دکھاؤ
سُنا ہے وہاں اِک پہاڑی نے
پٹڑی پہ دُھونی رَمائی ہے
چوتھی، پُراسرار سی کھونٹ کے دَر پہ
ڈائن بنی، بال کھولے کھڑی ہے
ہمیں ساتھ لے جاؤ، ڈائن دکھاؤ
ہمیں چھنّی کھچّی دکھاؤ!
ہمیں — ہم سے وعدہ کرو
بابا — وعدہ کرو!!

اور بابا ہمیں اپنے سینے سے چمٹا کے کہتے:
وہاں جا کے تم کیا کرو گے
وہاں کیا دھرا ہے
وہاں تو بس اک آہنی سُرخ کمرہ ہے
کمرے سے آگے
جہاں ریل کی لائنیں رُک گئی ہیں
سیہ رنگ کا ایک تختہ ہے
تختے پہ لکھّا ہے،
"اب آگے کچھ بھی نہیں ہے"
مرے پیارے بچّو!
نجانے مَیں کب سے
سیہ رنگ تختے کے آگے کھڑا ہوں
مُجھے غور سے دیکھ کر فیصلہ تُم کرو
فیصلہ خود کرو!

اور ہم
مُنہ پھُلا کر یہ کہتے:
نہیں، کچھ نہیں جانتے ہم
ہمیں چھَنّی چھُچی دکھاؤ

ہمیں — ہم سے وعدہ کرو
بابا! وعدہ کرو!!

اور پھر ایک دن
اپنے بابا کی اُنگلی سے چمٹے ہوئے
اپنے قصبے سے، گاڑی کے ڈبّے میں داخل ہوئے
اور مسرّت کی اک لہر
جسموں کے اعماق میں ہم نے محسوس کی
دل دھڑکنے لگے
تیز رفتار انجن کی چھک چھک کا حصّہ بنے
ہم کو ایسے لگا جیسے انجن
ہمارا بدن
ریل پرچھائیں ہے
جو ہمارے تعاقب میں
گرتی، سنبھلتی، گھسٹتی چلی آرہی ہے!

اور پھر یوں ہُوا
ریل کی کھڑکیوں نے ہمیں اپنی جانب بُلایا
ہمیں اِک انوکھا پُراسرار منظر دکھایا

یہ دیکھا کہ ساری زمیں
دھان کی بالیوں میں چھپی تھی
پرندوں کی ڈاریں
گرسنہ نگاہوں سے دھرتی کو تکتے ہوئے پَر فشاں تھیں
پرندوں کے اُوپر
کسی نرم ریشم کی بدلی کی
بکھری ہوئی دھجّیاں تھیں
ذرا اور اُوپر کو دیکھا
تو نیلے فلک کا بدن
بدلیوں کے دریدہ لبادے کی درزوں سے
سب کو نظر آرہا تھا
معاً "ہم" کے موٹے لبادے میں اک
درز اُبھری
کشادہ ہوئی اور روزن بنی
اور پھر "مَیں" نے
روزن سے باہر نکل کر یہ پوچھا
تجھے کچھ پتا ہے؟
فلک سے پرے اور کیا ہے؟؟
تو مَیں نے پلٹ کر

پرندوں کو، بدلی کو، دھرتی کو دیکھا
دھواں دھار انجن کو
انجن کے پلّو سے باندھی گئی ریل کو
ریل میں اپنے بابا کو
بابا کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دوسروں کو
سبھی کو نظر بھر کے دیکھا
تو اُس ایک تابندہ لمحے میں
مَیں
اوس کی اک چمکتی ہوئی بُوند بن کر
زمیں کی پلک پر لرزنے لگا
اپنے "ہونے" کا ادراک کرنے لگا!

اپنے ہونے کا ادراک کرنے لگا
پھر مَیں ڈرنے لگا
چھنّی پھپھی کی بُو سُونگھ کر کالے انجن نے
فرطِ مسرّت سے
اِک چیخ ماری تھی
اور اُس کی کالی جٹاؤں نے
پیچھے کی جانب کو اُڑ کر

گھسٹتی ہوئی ریل کے تن بدن کو چھوا تھا
دُھواں ریل کے پیٹ میں بھر گیا تھا
مگر پھر اچانک مجھے میرے بابا نے
پلنگ سے بیدار ہو کر کہا:
لو سفر کٹ گیا
اب اُٹھو
گاڑی رُکنے کو ہے اپنی چیزیں سنبھالو
زمیں پر اُتر کر، اُسے دیکھ کر
اپنی حسرت نکالو!

مگر مَیں تو پہلے ہی تیار تھا
ریل جیسے ہی، ہچکی سی لے کر رُکی
مَیں نے باہر کی جانب لٹک کر
کسی اندھی بنجر فضا میں
قدم اپنا رکھا
یونہی، لمحہ بھر کے لیے مَیں فضا میں معلّق رہا
پھر مَیں دھرتی پہ اُترا
دھڑکتے ہوئے وقت کے آخری بُعد میں آ گرا
چھننی کھچّی کی پھیلی ہُوئی

منجمد قاش پر
برف کی ایک پتّی کی صورت کہیں رُک گیا
مَیں نے دیکھا
مِرے چاروں جانب خَلا تھا
مِرا بابا جانے کہاں رہ گیا تھا
نہ انجن نہ گاڑی کے ڈِبّے
دُھواں، آگ، رفتار — کچھ بھی نہیں تھا
وہاں اب فقط ریل کی لائنیں تھیں
جو اِک مُردہ لمحے کی صُورت زمیں پر پڑی تھیں!

مگر مَیں تو اِک مُردہ لمحہ نہیں تھا
مِرے خشک بالوں کے نیچے
مِرے سُوکھے بے آب ہونٹوں سے اُوپر
لرزتی ہوئی چلمنوں والی
دو کھڑکیاں کُھل رہی تھیں
مَیں ان کھڑکیوں سے خَلا میں گھنی دُھند میں
چھُنّی کھچّی کے چوکور لوہے کے کمرے کو، سگنل کو
سگنل کے نیچے کھڑی اُس پہاڑی کو جس نے
سبھی ریل کی لائنوں کو معطّل کیا تھا — سبھی کو

اُبھرتے ہیولوں کی صورت میں
پہچاننے لگ گیا تھا
مگر پھر معاً میری آنکھوں میں بینائی
کوندے کے انداز میں ایسے آئی
کہ مَیں نے پہاڑی سے آگے
گھنی دُھند کے چاک سے
اُس سجیلے کف آلود دریا کو دیکھا
جو اَن گھڑ سے گھوڑے کے مانند
پرہم زقندوں میں مصروف تھا
جس پہ کاٹھی کا
بوجھل سا یہ آہنی پُل کا
بارِ گراں تک نہیں تھا!

نجانے مَیں کب تک
زقندوں کے منظر میں کھویا ہُوا
اپنی تارِ نظر میں بندھا
یُوں ہی محصُور رہتا
کہ دریا کے اندر
کسی چکنے پتّھر سے بھیگا ہُوا اِک پرندہ اُڑا

اُڑ کے دریا کے پرلے کنارے کی جانب گیا
اور پھر
میری، حیرت سے پھٹتی چمکتی ہوئی تیز
آنکھوں نے دیکھا
اُدھر، اُس کنارے پہ بھی
سُرخ سگنل تھا
چوکور لوہے کا کمرہ تھا
اور ریل کی لائنیں اُس طرف بھی
کسی مُردہ لمحے کی صُورت زمیں پر پڑی تھیں
کف آلود دریا کی جانب
سبھی ننگی بانہوں کو پھیلائے
بے حِس ہوئی تھیں!

تب اُس ایک بیدار لمحے میں
اِک اور کوندے نے جانے کہاں سے اُتر کر
مجُھے گود میں لے لیا اور کہا:
پُل نہ ہو تو
"یہاں" اور "وہاں" میں
زنگ آلود ماضی میں اور صاف شفّاف

آنے والے زمانے میں
ٹھہرا ہُوا "اب" کا لمحہ
یہ سگنل، پہاڑی کی دیوار
لوہے کا کمرہ
سدا ایک نقطے پہ قائم رہے گا
زمانے کی پھیلی ہُوئی ڈور میں
چھنّی کھچّی گرہ ہے
گرہ کھُل گئی گر
تو کچھ نہ رہے گا!

مگر آج میں سوچتا ہوں
مَیں خود بھی تو اِک ننّھی مُنّی گرہ تھا
مری ذات میں چھنّی کھچّی چھُپا تھا
مَیں اُس روز لمحے کے پُل کو اگر پار کرتا
تو پھر رُک نہ سکتا
اگر کف اُڑاتا ہُوا تُند دریا
مجھے راستہ دے ہی دیتا
تو مَیں آگے بڑھ کر
خلاؤں میں

ہر آتی جاتی صدا سے
فقط بھیک ہی مانگتا
مَیں —— ازل اور ابد کے کناروں میں
بے نام، بے سمت
اُن گھڑ سے گھوڑے کی ٹوٹی رکابوں سے
چمٹا ہُوا
بس بھٹکتا ہی رہتا
بھٹکتا ہی رہنا ! !

مجھے خزاں نے بہت ڈرایا!

خزاں —— دریدہ لباس پیڑوں کے شاخچوں سے
ہزار بدرنگ چیتھڑوں میں گری زمیں پر
بچھی، زمیں پر!
ہزار مجھ سے کہا کہ میں بھی
پھٹا پرانا سا ایک بدرنگ چیتھڑا ہوں
گرا پڑا ہوں
کہا کہ برہم ہوا کے جاروب لمحہ بھر میں
مجھے بھی ٹھنڈی غلیظ سڑکوں پہ پھینک دیں گے
مہیب، بھاری، کڑکتے بوٹوں سے روند دیں گے
ہزار اس نے مجھے ڈرایا
مگر مجھے ڈر ذرا نہ آیا
کہ میں اُدھڑتے، اُداس پیڑوں کے شاخچوں سے
زمیں پہ گرنے / زمین پر خوش بہ خوش اُترنے

کے فرق کو خوب جانتا تھا
تڑختے بے جان خشک پتّوں / ہمکتے بیجوں
کا بُعد بھی مجھ پہ آئینہ تھا
ہَوا کے ذرّوں کے قہر کی بھی خبر تھی مجھ کو
زمیں کے کچّے بدن سے بھی اب میں آشنا تھا!!

بیوگی

یہ آنکھیں
جو پھولوں، شگوفوں، جھروکوں میں بکھری پڑی ہیں
ستاروں کی پلکوں کے پیچھے
کھڑی ہیں!

یہ سیّال سورج
یہ شبنم کے قطرے
یہ مرمر کے تالاب میں
رقص کرتے ہوئے سرخ دھبّے
سلاخوں کے زنداں میں
جنگل کے فتنے
جواں قمقمے
سال خوردہ دیے
جگمگاتی ہوئی شاہراہیں

منوّر لبادے

یہ سب
سب کے سب
محض آنکھیں ہیں
ارض و سما میں
چمکتی ہوئی نور کی کرچیاں ہیں
جو ہر دم، مسلسل
سیہ لانبی پلکوں کو جھپکے بنا
دیکھتی جا رہی ہیں
خلاؤں میں اِک تار
بس دیکھتی جا رہی ہیں
اُسے — جو فضاؤں کے اُس پار
تاروں کی دُنیا سے لاکھوں برس دُور کے
اِک جہانِ نہفتہ کا باسی ہُوا ہے
مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے!

کہاں جا چُکا ہے؟
وہاں جس جگہ وقت کے
خستہ پاؤں رُکے ہیں؟

کئی آئینے
ایک ہی آئینے پر جُھکے ہیں ؟
ہیولوں کا
عُکسوں کا
اِک خاک ہوتا ہُوا راستہ بن چکے ہیں ؟

کہاں جا چُکا ہے ؟ ؟

سنجوگ

سُرخ گجروں میں نوٹوں کی باسی مہک
مُسکراتے لبوں پر کسیلا دُھواں

ہنستے ساگر سی آنکھوں میں خوابوں کے بجرے مہکتے ہُوئے بادباں
دم بدم اُس کی جانب رواں

شام اِک بھاری گھونگھٹ میں گلنار
ماتھے پہ آنسو کی بندی، نگاہوں میں شبنم کی ڈوری

گلی ــــ قہقہوں سے ہراساں
گلی جس کی دہلیز پہ گھڑسواروں کا، سوداگروں کا مہکتا ہُوا کارواں

آگ روشن ہُوئی، گرم لفظوں کی نوبت بجی
کچّے دھاگے ہیں جکڑے گئے اجنبی

اور مُبارک مُبارک کی پھٹتی صدائیں
زمیں سے فلک تک ہُوئیں پَرفشاں

اجنبی تھے، بنایا انہیں ہم سفر — اور فارغ ہوئے
پھر — تبسّم کو ہونٹوں سے ہم نے اُتارا، اُسے تہہ کیا جیب میں رکھ لیا

اور پھر چل پڑے، پتّی پتّی ہوئے، چاروں جانب ہوا میں بکھرتے گئے
اجنبی ہو گئے!!

الاؤ

سُنا ہے

زمیں ۔ سبز، پیلی، سیہ کروٹوں میں
چُھپاتی رہی ہے تمہیں
اپنے رنگیلے پَروں کے تلے
گرم خوابوں کی لوری
سُناتی رہی ہے تمہیں
سُرخ سُورج کے بھالوں
جھپٹتے عقابوں
چمک دار جبڑے دکھاتے ہوتے بادلوں سے تمہیں
کتنا محفوظ رکھا ہے اُس نے
تمہیں کتنا آرام اُس نے دیا ہے!

مگر تم نے دیکھا
یہ چھتنار سا سائباں
سبز مخمل کا بستر
بدن کی حرارت

تمہیں کتنی مہنگی پڑی!
تُم کہ خُود برق کی قاش تھے
ایک دستک تھے، جھنکار تھے
تُم کہ جھونکے کی تُندی،
لہُو کی جوالا سے سرشار تھے
تُم پَروں کے تَلے
زرد چُوزوں کی آواز بنتے گئے
اپنی آواز سے تُم بچھڑتے گئے

اپنی آواز سے تُم بچھڑتے گئے
اور درختوں، مکانوں
گپھاؤں سے
لاکھوں کی تعداد میں سالخوردہ،
گُرسنہ صدائیں
تمہیں دیکھ کر تلملاتی رہیں
ننگے ہونٹوں پہ سُوکھی زباں پھیرتی
تُم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھاتی رہیں
اب تمہیں کیا بتائیں
کہ اُن میں سے ہر اک صدا

جیسے اِک وحشی گُربہ تھی
دانتوں سے، پنجوں سے
ہر زندہ شے پر جھپٹتی تھی
اور دیکھتے دیکھتے
اپنے صیدِ زبوں کی رگوں میں
اُترتی تھی
پھر اُس کے ہونٹوں کی
اُجڑی منڈیروں پہ آکر
ڈراتی تھی سب کو
یہ آواز جو تُم نے ہونٹوں پہ اپنے
سجائی ہُوئی ہے
تمہاری نہیں ہے
تمہاری صدا، کون جانے، کہاں ہے!
کہاں ہے تمہاری صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو؟؟

اِدھر آؤ
اِک بار پھر مُردہ پیڑوں کے
اعضاء اُٹھائیں، چِتا اِک بنائیں

اِدھر آؤ، اک بار پھر ہم
الاؤ جلائیں
الاؤ کی اُجلی تمازت میں
حلقہ بنائیں
ہَوا برف کی قاش سی بن چکی ہے
ستاروں کے ٹھٹھرے پَروں میں
سکت تک نہیں ہے
سیہ رات — جیسے کہ دیوار ہے
جس میں چاند، ایک ٹوٹا سا دروازہ
کب سے کھُلا ہے
سُنو
اِس کھُلے دَر سے آواز اک آ رہی ہے
وہی لاکھوں برسوں پُرانی صدا!
جو تمہاری صدا تھی
تمہیں جانتی تھی!

اِدھر آؤ
پھر سے الاؤ جلائیں
اندھیرے کے ماتھے پہ

اک سُرخ قشقہ بنائیں
دھوئیں کے سندیسوں سے
گزرے زمانوں کو واپس بلائیں
سُنو
پھر سے ہونٹوں میں لرزش ہوئی
اور کہانی کے اعضا سُلگنے لگے
ہم نے دیکھا کہ ننگے بدن
سُرخ ہوتے الاؤ کے حلقے میں
سونے کی ڈلیاں بنے
داستاں گو کے ہونٹوں سے مَس ہو کے
سکّوں میں، لفظوں میں
ڈھلنے لگے
اور داستاں گو؟
اندھیرے کے سینے میں روشن ستارا
جو خود بھی سُلگتا ہُوا اِک الاؤ تھا
جس سے اُبھرتی کہانی
ہَواؤں، شگوفوں، پرندوں، گڈریوں
فلک پر چمکتے ستاروں
زمیں پر اُگی گھاس

اور گھاس میں تتلیوں، کالے ناگوں،
درندوں کی اک مشترک داستاں تھی
ابھی روشنی کی سیاہی / سفیدی میں
پانی کی آنسو میں / موتی میں
اور دل کی نفرت / محبّت میں
تقسیم کا وقت آیا نہیں تھا
ابھی آسماں اور زمیں میں
دوئی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا
شگوفوں کے موسم میں جب شب چہکتی
تو بھیگی ہوئی چاندنی میں
محبّت ۔ مکانوں، پرندوں، ستاروں کو
اِک ساتھ چھوتی
کبھی خاک پر
پریمیوں کی ملاقات ہوتی
تو تاروں کے اُجلے جھروکوں سے
سب دیوتا جھانک کر دیکھتے
آسمانوں سے نیچے اُتر کر
تماشے میں شرکت سے مسرور ہوتے
تماشہ / تماشائی کا فرق اُبھرا نہیں تھا

ابھی اُن میں کوئی جُدائی نہیں تھی
الاؤ کی میٹھی تمازت میں بیٹھا ہُوا داستاں گو
جو تُم تھے
تمہاری صدا تھی تمہاری صدا
اس صدا پر کسی اور کی حکمرانی نہیں تھی
تمہاری صدا
سارے عالم کی واحد صدا تھی
کہاں تُم نے کھو دی وہ اپنی صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو؟؟

دستک!

یہ دستک سی کیا ہے؟؟
ہر اک لمحہ ــــــ دستک

یہ دن رات اور ماہ و سال اور صدیاں
سبھی دستکیں!
میرے سینے کی دھڑکن بھی دستک
ہوا ــــــ رات بھر دستکیں دے کے
سوئے ہوؤں کو جگائے
یہ پھیلی ہوئی ــــــ اپنے اندر بھی، باہر بھی
چاروں طرف بے محابا بکھرتی ہوئی
چاندنی ــــــ جس کو مٹھی میں اپنی چھپائے
یہ بھوری زمیں!
آسماں کا سیہ بھاری در کھٹکھٹاتی
خموشی کے ریزوں کو چن چن کے جھولی میں بھرتی

ازل اور ابد میں تنے
اک بھیانک اندھیرے کی چادر میں محبوس
قرنوں کی آنکھیں جھپکتی ہوئی
بے ثمر، بے نتیجہ سی دستک کی آواز میں
غرق ہوتی ہوئی!!

صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے!¹

مذاق کرتے ہو؟
ہنس رہے ہو؟
زمیں کو دیتے ہو بیج کہتے ہو لوٹ آگاؤ
فلک سے کہتے ہو، تم درانتی چلاتے جاؤ!

صدا ہمکتی ہے
جیسے بنجر زمیں پہ
بادل کی چھت سے بوندیں ٹپک پڑی ہوں
فلک سے جیسے کتاب کوئی ہزار کوندوں
ہزار شبدوں میں ہولے ہولے اُتر رہی ہو!

صدا ابھرتی ہے
جیسے پتّھر پہ آئینہ کوئی گر پڑا ہو!

صدا حُدی خواں ہے

---

¹ اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر

اپنے ناقے کی ہمرہی میں
عقب میں روتی بسورتی ننھی مُنّی صداؤں کے بیج بو کر
زمیں پہ اپنی ہی کرچیاں ہر طرف گرا کر
مہیب چُپ کے قدیم صحرا میں
بے جہت، بے مُہار پھرتی رہے
بے جہت، بے مُہار پھرتی رہے گی، اُس کو
کبھی نہ اب تک کسی نے روکا
جو روک لیتا — تو لوٹ آتی؟
صدا کبھی لوٹتی نہیں ہے!!

اندر کے رونے کی آواز!

وداع کا وُہ منظر میں بھولا نہیں ہوں
کبھی بھُول سکتا نہیں ہوں
اُسے —— جس کے ہونٹوں پہ تھی خود شفق موجزن!
جس کی آنکھوں میں تارے کی اُجلی کرن
آنے والے زمانوں کی تنویر تھی
دُور تک، ہر طرف
ملگجے سے اندھیرے کی زنجیر تھی
رات بھیگی ہوئی تھی

پرندہ
اگر ریل کی دُکھ بھری چیخ سُنتا
تو اک پل میں گھبرا کے بیدار ہوتا
لرزتی ہوئی شب کی پلکوں سے
آنسو کی اک بُوند بن کر ٹپکتا

مگر ریل
ندّی میں بہتے ہوئے ایک تنکے کی صورت
بس اِک پَل رُکی
اور پھر چل پڑی تھی
دھواں مُو قلم تھا
بیاضِ فلک پر
پُرانی حکایت نئی طرز میں لکھ رہا تھا
وداع ہوتی شب اپنے اندر کہیں رو رہی تھی !

وداع ہوتی شب تو سدا سے
لبوں کو مقفّل کیے
اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہی ہے
سدا اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہے گی
دُھواں، آسماں کی طرف
اپنے ہاتھوں کو پھیلائے
آگن کی میٹھی حرارت سے
سُورج کے اُجلے لبادے کو
بوجھل بنائے
چمکتی ہوئی تیز بارش

زمیں پر اُتر کر زمیں کو معطّر کرے
اور تتلی
پَروں کی تمازت
شگوفوں کے چہروں پہ مَل دے
بُجھے راستے، جلتی شمعیں بنیں
اور کھیتوں میں
چاندی کے چھانجھن چھمکنے لگیں
سبز بچّے زمیں سے نئی گھاس بن کر اُگیں
سارے موسم
چہکتا ہُوا ایک موسم بنیں!
رنگ بکھریں
قباؤں پہ، چوغوں پہ، کوری رداؤں پہ نقشے بنائیں
یہ سب کچھ ہو
اِس سے سوا اور بھی اتنا کچھ ہو
کہ سارا جہاں جی اُٹھے
کِھلکھلائے
مگر وہ جو اندر ہی اندر سُلگنے کی، رونے کی
لمبی سزا ہے
بتاؤ

مَیں عمروں پہ پھیلی ہوئی اس سزا کو
کہاں لے کے جاؤں
کہاں اس کو پھینکوں ؟

سُنا ہے
یہ لمبی سزا ـــــ دائمی ہے
یہاں جو بھی آیا ہے
اُس کے بدن پر
غلامی کا اک نقش ایسا اُبھار اگیا ہے
جسے گنگا جل بھی مٹانے سے قاصر ہے
چاروں طرف سے ـــــ اُسے
اُس کے اپنے ہی سایے نے گھیرا ہُوا ہے
وہ اپنی ہی آواز کی قید میں ہے
ہمہ وقت اپنے ہی خنجر کی زد میں کھڑا ہے
پرندوں، چرندوں، درختوں
زمیں پر سدا رینگنے والے کیڑوں
سبک، مدھ بھری شہد کی مکھیوں
اور بھونروں میں
بس اُس نے ہی خود کو قاتل بنایا ہے اپنا

وہ اپنے لیے
آپ ہی روگ بنتا گیا ہے!

ہَوا سرد ہے
اور وہ خود
جیسے اک سر بہ زانو جہاں گرد ہے
لاکھوں قرنوں کی اندھی مسافت کا
بے کارواں اک مُسافر ہے
پھیلے ہوئے "ہست" کے ایک گوشے میں
سمٹا ہوُا ایک پنچھی ہے
دھرتی — جو اب تک اُسے
گود میں لے کے لوری سُناتی رہی تھی
لرزتی ہوئی اُس کی پلکوں پہ
پَل بھر چمک کر
ابھی ایک موٹے سے آنسو کی صورت
کہیں دُور، اپنے ہی اندر
سُلگتے ہوئے سُرخ لاوے کی ٹھہری ہوئی جھیل میں
جا گری ہے
مجھے اُس کے گرنے کی آواز آئی ہے

آواز مجھ کو ہمیشہ سے آتی رہی ہے
مَیں اندر کے رونے کی اس بھیگی آواز کو جانتا ہوں
ازل سے مَیں اُس بھیگی آواز کو سُن رہا ہوں
اسے خوب پہچانتا ہوں!!

اک کتھا انوکھی

جا بھی چکے تھے اور رُک کے بھی کھڑے تھے ہم
اپنے سے دُور جا کے بھی ہم اپنے پاس تھے

ترتیب

نظمیں

دیوارِ گریہ (۱۹۸۶) ۶۹۳

انگیٹھی (۱۹۸۶) ۶۹۵

چرنوبل (۱۹۸۶) ۶۹۷

وہ کیا ہے؟ (۱۹۸۶) ۶۹۹

خاک کا رزق تھا وہ (۱۹۸۶) ۷۰۱

اک ڈری ہوئی آواز (۱۹۸۶) ۷۰۳

سنّاٹا (۱۹۸۷) ۷۰۵

کہاں گئی ہو! (۱۹۸۸) ۷۰۷

اگر آج تم (۱۹۸۸) ۷۰۹

ہَوا سے کہنا! (۱۹۸۸) ۷۱۱

عذاب (۱۹۸۸) ۷۱۳

موت (۱۹۸۸) ۷۱۵
صحرا کی بارش (۱۹۸۸) ۷۱۷
تو پھر اب کیا کریں (۱۹۸۸) ۷۱۹
عجب وہ شخص تھا (۱۹۸۸) ۷۲۱
یہی اپنا ٹھکانہ ہے (۱۹۸۸) ۷۲۳
بن باس (۱۹۸۸) ۷۲۵
پرندو (۱۹۸۹) ۷۲۷
تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منتظر (۱۹۸۹ ۷۲۹
چوٹے (۱۹۸۹) ۷۳۳
اب اتنی دُور تو مت جاؤ (۱۹۸۹) ۷۳۵

طویل نظم

اک کتھا انوکھی (۱۹۹۰) ۷۳۷

اک کتھا انوکھی

سفر سے مفر نہیں ہے ۔ اکثر لوگ یا تو دائرے کی کھائیوں میں سفر کرتے ہیں یا پھر خطِ مستقیم پر رواں دواں نظر آتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے بیک وقت کئی اطراف میں سفر کیا ہے ـــ دائرے میں سفر کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ انجام اور آغاز کا کوئی وجود نہیں ہے، علت اور معلول کی حیثیت ثانوی ہے ۔ وقت کا ہر نقطہ بیک وقت آغاز بھی ہے اور انجام بھی ـــ خطِ مستقیم پر سفر کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ کوئی بھی عمل آغاز اور انجام سے بے نیاز نہیں ، زندگی میں کہیں بھی تکرار نہیں ہے ۔ قدم قدم پر منظر نامہ تبدیل ہو جاتا ہے ۔ خطِ مستقیم کو اختیار نہ کیا جائے تو زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتے گھومتے ایک روز تھک ہار کر رک جاتی ہے ـــ مگر، جیسا کہ میں نے کہا ، اس چند گام عرصۂ حیات میں کچھ اور طرح کے سفر بھی ہیں ۔ مثلاً تہ در تہ سفر جو محض ایک دائرے کا سفر نہیں بلکہ ایک ایسے چکر دار (SPIRAL) کا سفر ہے جو دائرہ در دائرہ باہر کی طرف بھی پھیلتا ہے اور اندر کی طرف بھی ! تالاب

میں کنکر پھینکنے سے ہر دم وسیع سے وسیع تر دائروں کا جو منظر ابھرتا ہے وہ اسی سفر سے مشابہ ہے بشرطیکہ ہم اس کے ساتھ دائرہ در دائرہ سمٹنے کا منظر بھی منسلک کر لیں ___ پھر ایک سفر عمودی نوعیت کا بھی ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے سفر سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ سفر کائنات اور ذات میں، موجود اور وجود میں، جسم اور روح میں حائل فاصلوں کو عبور کرتا ہے۔ بظاہر یہ اور اسی وضع کے کچھ اور سفر محض چند گام کے ہیں مگر ساری عمر بھی چلتے رہیں تو یہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ تخلیقِ شعر کا عمل بھی مزاجاً ایک ایسا ہی سفر ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے بجائے بعض پُر اسرار ابعاد کے اندر طے ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر شعری مہم ایک انوکھی کتھا ہے ___ اگر وہ انوکھی نہ ہو تو پھر وہ شعری مُہم نہیں، کوئی اور شے ہے۔ ہر نظم بلکہ ہر شعر کی تخلیق ایک نئے دیار میں پا پیادہ سفر کرنے کا نام ہے اور مَیں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے عمر بھر اس سفر میں مبتلا رہنے کا موقعہ ملا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اسی سفر کی ایک صدی، ایک سال یا ایک لمحے کی کہانی ہے۔ اگر قاری میرا ہم سفر بن کر، اس انوکھی کتھا کو میرے ساتھ سننے پر مائل ہو جائے تو مَیں اسے اپنے لیے ایک بہت بڑی سعادت سمجھوں گا۔

وزیر آغا

سرگودھا ۱۴ر اگست ۱۹۹۰ء

نظمیں

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عُمر ہی چلنا پڑا تجھے

کچے گھڑے کی ناؤ میں کرتے رہے سفر
کیسے عجیب لوگ تھے دریا کے پار کے

دیوارِ گریہ!

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اُس کی
وہ جب پلکیں اٹھا کر اک نظر تکتی
تو آنکھوں کی سیہ جھیلوں میں
جیسے مچھلیوں کو آگ لگ جاتی
ہزاروں سُرخ ڈورے تلملا کر جست بھرتے
آبِ گُم کی قید سے باہر نکلنے کے لیے
سو سو جتن کرتے
مگر مجبور تھے
چاروں طرف آنسو کے گنبد تھے
نمی کے بُلبُلے تھے
اور اک دیوارِ گریہ
جو ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی تھی!

عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اُس کی
بظاہر آنے والوں کو "نہ آنے" کے لیے کہتی
بباطن چاہتی دیوار کو وہ توڑ کر اُس تک پہنچ جائیں!

کھڑا ہوں مَیں پسِ دیوارِ گریہ
نمی کے بُلبلوں کو اُس کی پلکوں پر لرزتے، جھلملاتے
دیکھتا ہوں، اُنگلیوں سے چھُو بھی سکتا ہوں
مگر دیوارِ گریہ کو
اُفق سے تا اُفق پھیلی ہوئی
شیشے کی اس شفّاف چادر کو
کبھی، اب تک تو کوئی توڑ کر آگے نہیں آیا
میں اک آنسو بھرے لمحے کی سَلوٹ
مَیں کیسے پار کر سکتا ہوں اس کو!!

انگیٹھی !

بدن اُس کا
ہزاروں سُرخ پھولوں سے فروزاں تھا
تمازت اور خوشبو ـــــــ دو جواں سکھیاں
اُسے سرگوشیوں میں چھیڑتی تھیں
خوشی کی آنے والی ساعتِ نایاب سے
اس کو ڈراتی تھیں
اُسے، برفاب سپنوں کے پگھلنے کا
عجب منظر دکھاتی تھیں !

اور اب چاروں طرف
یخ بستگی ہے
بکھرتی راکھ نے سب سُرخ پھولوں کو بجھایا ہے
تمازت اور خوشبو

دَم بخود ہیں
سیاہی، قطرہ قطرہ
نرم بادل کی سیہ تب سے ٹپک کر
بیاضِ ارض کو گدلا رہی ہے
کواڑوں کی چھُپی درزوں سے
ٹھنڈی یخ ہَوا کمرے کے اندر آ رہی ہے
سُلگتے کوئلوں کو کھا رہی ہے !!

چرنوبل !

خود اپنے تن کی گرمی سے پگھلنا
موم ہو جانا
عناناؑ کا خود اپنی کوکھ کے اندر اُتر جانا
سفیدی اور سیاہی کا چمکنا
ایک ہو جانا
زمیں کے بازوؤں میں جھولنا
مستی سی بن کر
چار سُو اُڑنا
محبّت کے سندیسے بھیجنا
سینے سے چمٹانا
یہی اُس کا تھا افسانہ !

اور اب اُس کا پگھلنا

اک قیامت ہے

زمیں کی کوکھ میں ہیجان ہے

آکاش ـــــ اک تانبے کا خیمہ ہے

ہُوا نے بھر لیا ہے اپنا نافہ

اُس کے جلتے جسم کی بُو سے

ہُوا اب چوکڑی بھرنے کو ہے

اُڑنے کو ہے ـــــ پاگل ہُوا

اب سبز کھیتوں، ناچتے شہروں میں جائے گی

پھلوں، پھولوں، چہکتی کونپلوں کو چھُو کے گزرے گی

بدن کی خاک میں اُترے گی اور بیمار نسلوں

خون کے پیاسے سیہ کانٹوں کی صورت

اُگ پڑے گی

سُرمئی ناگوں کی صورت

پھیل جائے گی!

ہُوا اب خشک بُو ہے

قہر ہے

یہ خوب رو پاگل ہُوا

اب زہر ہے!!

وہ کیا ہے؟

وہ کیا ہے
جس کی خاطر مَیں پہاڑوں، ریگ زاروں
بند گلیوں
تنگ، اُبڑی گھاٹیوں میں گھومتا ہوں؟
لہو بن کر
بدن میں دوڑتا ہوں
کبھی سرکش ہَوا کی موج ہوں مَیں
کبھی لاوے کی صورت رینگتا ہوں
وہ کیا ہے جس کی صورت سے بھی مَیں واقف نہیں ہوں
جسے مَیں نے کبھی دیکھا نہیں ہے
مگر جو ہر جگہ ہے
ہر بُنِ مُو سے اُگی ہے
کرن کی قوس میں

چُپ کی چُبھن میں
سانپ کی پُتلی میں
اور سورج مُکھی کی آنکھ میں موجود ہے
جو رات کے پچھلے پہر شبنم میں ڈھلتی ہے
سحر دم اک عجب جھنکار بنتی ہے
کبھی جب شام کی ڈولی
تھکے ہارے ہوئے بادل کے شانوں سے اُترتی ہے
تو میری تشنہ لب آنکھوں کو
اک ٹھنڈا ستارہ بن کے ڈستی ہے
تمہاری راہ تکتی ہے!

خاک کا رزق تھا وہ

پَو پھٹی
رات نے گھبرا کے کہا :
مَیں تو برباد ہوئی
میرا خیمہ ، میری چادر ، میری توقیر گئی
مَیں تو تاراج ہوئی !

دُور
اک بانسری
اک شہد کی پیاسی مکّھی
رس بھرے ہونٹوں سے
امرت بھرے پھُولوں کے کناروں سے اُڑی
اور بولی :
مَیں تو سرشار ہوئی

گنگناتی ہوئی آواز بنی
رقص کرتی ہوئی رفتار ہوئی !

اور وہ شخص
خُنک نیند، دہکتی ہوئی بیداری کے
(دُھوپ اور سائے کے)
موہوم سے سنگم پہ کہیں
سبز صدیوں سے لبالب بھرے
ساگر کے کنارے پہ رُکا
اک لرزتا ہُوا شفّاف سا
آنسو بن کر
اپنی پلکوں سے گرا
خاک کا رزق تھا وہ
خاک ہوا !!

اک ڈری ہوئی آواز

رات کو جب تاروں کی آنکھیں
گھورنے لگتیں
اور شب کے ناراض پرندے
تیز کٹیلے خنجر ایسے پنجے لے کر
ہر سُو اُڑتے
گہرے جنگل کے اندر سے
لال انگارہ بھوکی نظریں
باڑے پر مرکوز دکھائی دینے لگتیں
تو — ایسے میں
مَیں، اپنے بستر میں دبکا
اک بھاری کمبل میں لپٹا
آنکھیں میچے
آنے والی سبز رُتوں کے منظر تکتا

اپنی آنکھ کے ٹھہرے موسم میں خوش رہتا
پر شب کی برفیلی، خونی، گھورتی آنکھیں
گھنی گھنیری باڑ کو تنکا تنکا کر کے
ٹھہری آنکھ کے باڑے کے اندر آجاتیں
ممیاتی خوشیوں کو ہانک کے لے جاتیں
جنگل کے گہرے سایوں میں
آوازوں کے قتل کا منظر لَو دیتا
پھر بجھ جاتا
پھر سناٹا
پھر باڑے میں
اک ڈری ہوئی آواز
اکیلی ـــــ ممیاتی آواز !!

سنّاٹا

سنّاٹا — اک چیز عجب ہے!
ننھّی مُنّی، دانہ دُنکا چگتی آوازوں کا
بہت پُرانا دشمن ہے!

سنّاٹا، اک چیز عجب ہے
پت جھڑ کی پھیلی چادر پر
پھُول ایسے قدموں کی آہٹ
چھوٹے سے اک کنکر کے گرنے پر
نیلی جھیل سے قازوں کی پرواز
چھنکتی چاندنی کی پازیب سے ٹوُٹی
اک پیاسی چہکار
سبھی شرمیلی، ڈرتی، چھن چھن اُڑتی
آوازوں کا

سنّاٹا ـــــ اک بہت پرانا دشمن ہے !

سنّاٹا، اک چیز عجب ہے
چڑیوں کی آوازوں کا جب بھوجن کر کے
پھُولے پیٹ کو سہلاتا ہے
اور پھر
گہری بوجھل نیند میں کھو جاتا ہے
تو اس کے خرّاٹوں کی آواز
اُچھلتی، بل کھاتی
اک موج ہَوا کی بن جاتی ہے
سنّاٹے کے سیلِ رواں کی
اپنی اک بھاری آواز اُبھر آتی ہے !!

کہاں گئی ہو!

کہاں گئی ہو ؟
فلک کے اُس پار جا بسی ہو ؟
زمیں کی گہری گپھا کے اندر اُتر گئی ہو
کہاں گئی ہو ؟

تمہارے ہونے سے دل جواں
رہگزر رواں تھی
گلاب چہروں سے ساری بستی مہک اٹھی تھی
خوشی، مکانوں کے ساغروں سے چھلک پڑی تھی
تمہارے جانے کے بعد
اب کچھ رہا نہیں ہے
اُداس شاخوں میں
اک بھی بھیگی صدا نہیں ہے

ہَوا سے خوشبو

زمیں سے برکھا خفا کھڑی ہے !

کہاں گئی ہو ؟

رسیلی، میٹھی، گداز ـــــ گھی میں گُندھی رُتو

تم کہاں گئی ہو ؟ ؟

اگر آج تم ـــــ!

اگر آج پھر دن ڈھلے تم
پہن کر وہی اپنا پہلا سجیلا بدن
آگئی ہو
مجھے پھر کسی سر پھری موج کے رُوپ میں
کف اُڑاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو
تو آؤ ـــــ قریب آ کے دیکھو
کہ مَیں تو ہزاروں برس سے
شب و روز ساحل کی جانب
تمہاری ہی جانب
اُمنڈتا رہا ہوں
کبھی مَیں نے سوچا نہیں تھا
کہ اک روز جب مَیں چٹانوں کے قدموں میں
ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر آ کے بچھنے لگوں گا
تمہارے قدم چھُو سکوں گا

تمہیں ـــــ اس جگہ ، ان چٹانوں کے نیچے
بچھی ریت پر
اک نہ اک دن تو آنا تھا
سو آ گئی ہو
مجھے اس جگہ روز آنے کی عادت ہے ـــــ مَیں
اپنی عادت سے مجبور ہوں
آ گیا ہوں
مگر مجھ میں اور تم میں
رشتے کی وہ ریشمیں ڈور سی
اب کہاں ہے ؟
زمانہ ـــــ کماں سے نکلتا ہوا تیر تھا
جا چکا ہے
مَیں اک خستہ تن موج ہوں
لَوٹ جانے کو ہوں
اور تم
سچ بتاؤ ، تمہیں اب یہاں سے کہاں
کس طرف کُوچ کرنا ہے ؟؟

ہَوا سے کہنا !

ہَوا سے کہنا
خدا را اتنی نہ تیز آئے
کہ سبز پتّے
لچکتی شاخوں سے ٹوُٹ کر گر پڑیں
زمیں پر
ہَوا سے کہنا !

ہَوا کے چرکے
نجانے کب سے مَیں سہہ رہا ہوں
مگر یہ چرکا تو سارے چرکوں سے سخت تر ہے
کہ سبز پیڑوں سے چادریں بھی اُتار لے وہ
تمام گہنے بھی چھین لے وہ
برہنگی کا عذاب نازل کرے زمیں پر

زمیں کے معصوم باسیوں پر

برہنگی سے نہیں ہے بڑھ کر عذاب کوئی
ہَوا سے کہنا !

ہَوا سے کہنا
خدا را اتنی نہ تیز آئے !!

عذاب!

ہَوا ___ ابھی چلی نہیں
ابھی نگر کے سارے پیڑ چُپ کھڑے ہیں
دم بخود ہے ان کے پاؤں میں زمیں
فضا میں دُور دُور تک کوئی پرند بھی نہیں
کہاں گئے وہ سبز طشت گھاس کے، کہاں گئے
وہ موتیے کے پھُول چاند رات کے
کدھر گئے وہ نیل سر، وہ دُودھ جھیل
خواب کی؟

دہکتا سُرخ کوئلہ سا آفتاب
دھوئیں کے زہر میں بجھے
ہزار تیر پھینکتا
بدن کی ساری پسلیوں کو توڑتا، ہَوا کی

نالیوں کو بند کر کے جھومتا
کراہتی زمین پر
عذاب بن کے ٹوٹتا
دہکتا سُرخ کوئلہ ـــــ اُتر چکا ہے
تن کی پور پور میں
اُتر رہا ہے روح کے غبار میں

مَیں کیا کروں ؟
کہاں چھُپوں ؟
تمام پیڑ بے لباس
تمام سائباں پھٹے
کہو نہیں کہ شام اب قریب ہے
کہ شام خود بھی آگ ہے
سگار کی سفید نرم راکھ میں ـــــ

ـــــــــــــ

موت !

ٹھنڈا ، کڑوا ـــــ کرب
جو میری اک اک رگ میں
آتش خیز مواد کی صُورت چھُپا پڑا تھا
آگ کے بھیگے لمس کا طالب
پنبہ پنبہ ، تنکا تنکا ، جمع ہوا تھا
آج کہیں سے اُڑتا ہوا اک تُند شرارہ
اس کے تنکوں کو تاراج
گھروں اور طاقوں کو کافور کیئے
اک سانپ کی صورت شوُک رہا ہے
مجھ کو خس کا اک جلتا انبار بنا کر
ننھے مُنّے پھُولوں کی بھیگی آنکھوں کو
راکھ بنانے آپہنچا ہے !

کرب کی بھی تو آخر کوئی صورت ہوگی
اُبلی آنکھیں، گندے لانبے دانت، اُدھڑتی کھال
نکیلے ناخن،
پر یہ کیسا کرب ہے جس کے
چہرے پر کوئی نقش نہیں ہے
کیسا زہر ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے ؟؟

صحرا کی بارش!

کہاں ہے وہ بادل ؟
پرندے کہاں ہیں ؟
کہاں ہیں وہ صحرا کے سینے سے
دم بھر میں
باہر کی جانب اُڑتے ، لپکتے ہوئے
سُرخ پھُولوں کے کوندے ؟
جو ندّی کے ویراں کناروں کی
بے آب درزوں میں
سوئے پڑے تھے
کہاں ہے وہ برکھا
کہ جس نے ہتھیلی کی ریکھا کو
خوشبو بھرے دُودھ سے بھر دیا تھا ؟
کہاں ہے وہ ندّی

کہ جس نے مجھے
اپنے بنجر کناروں پہ اُگنے، ہمکنے دیا تھا ؟
مجھے ایک پَل کے لیے
اک لرزتے ہوئے سبز قطرے کی صورت
گراں تاگراں پھیلے صحرا کی
پتّھریلی چپ کے مقابل
کھڑا کر دیا تھا ؟؟

تو پھر اب کیا کریں!

تو پھر اب کیا کریں
کس سمت جائیں
رات کے کڑوے کسیلے جنگلوں میں صبح تک بھٹکیں ؟
یا اس صدیوں پرانے
سنگِ مرمر کے گھِسے زینے پہ
ڈر ڈر کر قدم رکھتے
خود اپنے آپ میں اُتریں ؟

تو پھر اب کیا کریں !
آکاش پر تاروں کے کانٹے ہیں
زمیں، کُبڑی غُصیلی جھاڑیوں سے اَٹ چکی ہے
چمکتی تُند آنکھوں سے بھری ہے
دُکھن سی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے !

تو پھر اب کیا کریں !
مُشکیں کسی ہیں
لب سِلے ہیں
اور بُجھی آنکھیں
گڑھوں میں دھنس گئی ہیں
فقط کانوں کے در وا ہیں
دہکتی، ڈستی باتوں کے
سیہ سنپولیے
کانوں میں گھستے جا رہے ہیں
بدن میں زہر سے لبریز شُوگر بھر گئی ہے
نڈر تھی روح لیکن ڈر گئی ہے
تو پھر اب کیا کریں !!

عجب وہ شخص تھا!

عجب وہ شخص تھا
دن بھر خود اپنے تن کے مرقد میں پڑا رہتا
مگر جب رات آتی
آسماں کے پار کوئی روشنی سی جھلملاتی
روشنی کی دُودھیا آنکھیں
فلک کے روزنوں سے جھانکتیں ——— تو وہ
اُچک کر، اپنی آنکھوں کے سیہ پٹ کھول کر
باہر نکل آتا
تھکے ہارے ہوئے گاؤں سے ہٹ کر
لرزتی، جھلملاتی چاندنی کے
طشت میں رُک کر
خود اپنے پاؤں کی ایڑی کو مرکز مان کر
چکّر لگاتا ——— گھومنے لگتا
سحر تک گھومتا جاتا

کہ جیسے کوئی سیّارہ تھا وہ بھی!

عجب وہ شخص تھا

زہرہ، زمیں، مریخ —— سب
سُورج کو کعبہ جان کر قربان ہوتے ہیں
مگر وہ شخص تو
اپنے ہی مرکز پر
نجانے کب سے گرداں تھا
سُنا ہے کوئی سُورج
اُس کے اپنے تن کے اندر جل اٹھا تھا
وہ جس کے گرد
شب بھر گھومتا تھا!

یہ کیسا روگ تھا
کیسا یہ گھاؤ تھا
جو اُس کے بند سینے میں
الاؤ بن کے جلتا تھا
عجب وہ شخص تھا!!

یہی اپنا ٹھکانہ ہے!

ستارہ جیسے آنسو ہے
تری پلکوں پہ آکر رُک گیا ہے، تجھ سے کہتا ہے:
یونہی بس دو گھڑی رُک لوں —— تو چلتا ہوں
مجھے بھیگی ہوئی کچھ اور پلکوں پر بھی جانا ہے
مسافر ہوں، مسافر کا بھلا کوئی ٹھکانہ ہے!

ستارہ اک مسافر ہے
ابھی کچھ دیر وہ مہماں ہے تیرا
پھر اس کے بعد —— کالی رات کی پلکوں پہ چمکے گا
سحر دم، اوس بن کر پھول کی
آنکھوں میں اُترے گا
پھر اس کے بعد —— جب گہری گھنیری
شام آئے گی

تو وہ بھی ساتھ آئے گا
معاً دیکھے گا مجھ کو
اور پھر یک دم پَروں کو جوڑ کر
اک تیر کے مانند جھپٹے گا
مری بھیگی ہوئی پلکوں پہ اُترے گا
اُتر کر پَر سمیٹے گا
کہے گا : بس یہی منزل تھی میری
اسی بستی میں آخر ایک دن ہم سب کو آنا ہے
یہی اپنا ٹھکانہ ہے !!

بن باس

وہ ۔۔۔ دو بھائی
ایک ہی جڑ سے انکھوے
بن کر پھوٹے
اک نے پیڑ کا سوانگ رچایا
دوسرا ۔۔۔ تنگ کلادے میں سے
زور لگا کر نکلا ۔۔۔ اور آزاد ہوا
اک اک جنگلی پھول سے اُس نے پیار کیا
کیڑے، بھونرے
مدھ مکھیوں کے چھتے
نیلے کچ آکاش کے ساگر میں بہتے
کونجوں کے بجرے
سب کو ۔۔۔ ہاں اُن سب کو اُس نے
اپنا یار بنایا

بادل بھونکے، بجلی کی غرّاہٹ جاگی، تند ہوا نے
اپنے آپ سے باہر آکر، پاگل پن میں
ٹکّر مار کے پیڑ گرائے
پَر بکھرائے، پھولوں کو تاراج کیا
تو ایسے میں بھی، اُس نے اپنے
سب یاروں کا ساتھ دیا

پھر لمحے جاگے
سال بنے
پھر سال اُچھل کر صدیوں میں تبدیل ہوئے
پھر صدیاں اُس کو ساتھ لیے
کیا جانے کن رستوں پہ گئیں
کن ریت بھرے صحراؤں میں روپوش ہوئیں

پر اُس کا جُڑواں بھائی اب تک
گھنی گھنیری چھاؤں اوڑھے
اپنی جڑ سے جُڑا ہوا مجبوس کھڑا ہے
اُس کا رستہ دیکھ رہا ہے!!

پرندو !

پرندو !
خاک پر چلتے رہو
چلتے رہو پیہم
لکھو ۔۔۔ لکھتے رہو
پنجوں کے دلکش مُوقلم سے
اک انوکھی داستاں ہر دم
زمیں سے رزق چُننے کے بہانے
بکھیرو ہر طرف قصّے پُرانے
ازل سے تا ابد
لاکھوں کروڑوں "نُور کے سالوں" کی حد تک
رقم کرتے چلو تاریخ ساری
کچھ اپنی ، کچھ ہماری
گہے اس خاکداں کی

اور کبھی آکاش کے
ان خوب رُو ٹھنڈے ستاروں کی
لکھو ـــــ لکھتے چلے جاؤ
ہَوا چلنے سے پہلے جس قدر بھی لکھ سکو ـــــ لکھّو
پرندو !
خاک پر چلتے رہو
چلتے رہو ـــــ یوں ہی
لکھو ـــــ لکھتے رہو
لکھتے رہو ـــــ یُوں ہی !!

تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر!

نہیں! تمؑ نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر
وہ منظر کہ جب چاند
گِھرتا ہے بھاری سیہ بادلوں میں
تو وہ کیسے
گھبرا کے آگے کو بڑھتا ہے
یوں — جیسے اک تیز قینچی
کُھلے گرم کپڑے کے تھانوں
کی گہری تہوں میں
اُترتی چلی جا رہی ہو
مگر ہاتھ
قینچی چلاتا ہوا ہاتھ
نظروں سے اوجھل ہو!

تم کیسے جانو
گھنے گھور جنگل میں وہ خود تو
غائب تھا
لیکن کسی شے کے چلنے
لپکنے کا منظر
مسلسل نظر آرہا تھا
نظر آرہا تھا کہ کیسے درختوں کی بانہیں
کڑکتی تھیں
کیسے سیہ ناگ دو نیم ہوکر درختوں سے گرتے تھے
اور سبز بیلوں کی پتلی، گندھی
پیچ در پیچ آنتوں کے کٹنے کی
آواز آتی تھی
کیسے —— کٹاؤ کی ضربِ مسلسل سے
گھرے، گھنے، سبز جنگل میں
تلوار کی دھار ایسا
منوّر سا اک راستہ
بن رہا تھا!

نہیں! تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر

تمہیں تو خبر ہی نہیں ہے کہ مَیں کیسے
اُس تیز تلوار کی دھار ایسے
چمکتے ہوئے راستے پر
رواں تھا
مری انگلیوں میں قلم
سامنے
سبز لفظوں کا جنگل گراں تا گراں تھا

نہیں !
تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر
مَیں کیسے، تعاقب میں اُس کے
خود اپنے ہی اندر کے جنگل میں
داخل ہُوا
کُنڈ پوکھر میں اُترا
خود اپنے ہی پاتال میں جا گرا

اور میرے عقب میں
گھنے، گہرے جنگل کی باہوں سے لپٹے
سیہ، شُوکتے
پیچ در پیچ سانپوں نے
اک جال سا

بُن دیا
واپسی کا کوئی اک بھی رستہ نہ رہنے دیا !

مگر وہ چمکتا ہوا اک گنڈا سہ
کہ بجلی کا کوندا تھا
ہر دم مرے سامنے
کوندتا اور لپکتا رہا
اور مَیں ؟
مگر تم نے دیکھا نہیں ہے وہ منظر !!

چوٹ!

ان کو گھر کا نام نہ دینا
گھانس پھونس کے
لکڑی یا اینٹوں کے گھروندے
مَیں گر ان سے ناتہ جوڑوں
یہ بھی مجھ سے ناتہ جوڑیں
ناتہ توڑوں
یہ بھی سارے ناتے توڑیں
یاد کہاں رکھتے ہیں مکیں کو
جانے والے
آنے والے
سب لوگوں سے یہ بیگانے
اپنی ہی خوشبو کے قیدی
اپنی ہی آواز کو جانیں!

میرا گھر تو میرا تن ہے
جنم جنم کے قول نبھائے
جینے مرنے
سپنے تکنے
سپنوں کی ڈوری میں بندھ کر
لمبے کڑے سفر کرنے کی
ہر بپتا میں
ہر آفت میں
ساتھ مرا وہ دیتا جائے
میرے دُکھ میں اپنا درد ملائے
میرا سارا بوجھ اٹھائے
مَیں جب ٹوٹوں
اس کے اندر بھی جیسے
کوئی چیز
چٹخ کر ٹوٹے
اک جھنکار سی آئے
پھر جیسے کوئی اپنے آنسو ضبط کرے
اور ـــــــ رُندھی ہوئی آواز میں پوچھے :
چوٹ بہت گہری تو نہیں تھی ؟؟

اب اتنی دُور تو مت جاؤ!

نُورانی پیکر تو بہت ہیں
کیا ایسی کوئی ہستی بھی ہے
جس کے سینے کے معبد میں
اک گیلی لکڑی صندل کی
سُلگ رہی ہو؟
خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہو؟
شور مچاتی، دل دہلاتی
آگ کی شورکر
گزر چکی ہو
ڈرے ہوئے جسموں کی بھگدڑ
ختم ہوئی ہو
ٹھنڈی میٹھی اک سرگوشی
راکھ ہوئے میدان میں پھرتی

زخموں پر پھاہے رکھتی ہو ؟
بازو سے لٹکی چھاگل سے
سُوکھے ہونٹ ہرے کرتی ہو ؟
اور ہوا میں
اپنے دونوں ہات اُٹھا کر
جانے والوں کے دامن کو پکڑ رہی ہو
اور کہتی ہو :
رُک جاؤ !
اے لوگو ! اک پل رُک جاؤ
اب، اتنی دُور تو مت جاؤ
تم اتنی دُور تو مت جاؤ !!

اک کتھا انوکھی

اک جنگل تھا
گھنی گھنیری جھاڑیوں والا
بہت پرانا جنگل
جس کے اندر
اک کٹیا میں
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
اپنی کھال کے اندر گم صم
جانے کب سے
کتنے جگوں کے
پھٹے پرانے چوغے پہنے
وہ اک خستہ بیج کی صورت
بے سُدھ
بے آواز پڑا تھا!

بادل آتے
کڑک گرج کر اُسے بُلاتے
بن برسے ہی پچھم کی جانب مڑ جاتے
ہوا دہکتی آنکھیں
ٹھنڈی پوریں لے کر
اس کے چاروں جانب پھرتی
پر کیا کرتی
گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
سب کُٹیا کے باہر ملتے
سبھا جماتے
اس سے کہتے :
"اب تو اٹھ جا
آخری یُگ بھی بیت چکا
سُورج میں کالک اُگ آئی
چاند کا ہالہ ٹُوٹ گیا
دیکھ کہ گھاس جلی جھُلسی ہے
ندیوں میں جل سُوکھ گیا
جس بھی سنہری بیج سے
یہ برہمانڈ اُگا تھا

واپس شاید اسی کے اندر
اُتر گیا!"
لیکن وہ کُٹیا کے اندر
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
بند پڑا ہے
یوں لگتا ہے جیسے اب وہ
اپنی شکتی کھو بیٹھا ہے
یا پھر باہر آنے سے
وہ ڈرا ہوا ہے
اور برہمانڈ کے
آگے آنے کو
بہت بڑا اک پاپ سمجھتا ہے!

پاپ اور پُن کی کتھا پُرانی
کون اس کو سمجھائے
نازک تتلی رس چوُسے
اور بھونرا شور مچائے
رشتے
بانکی موجوں ایسے

لپک جھپک کر آئیں
پل بھر رُک کر
گرہ بنائیں
پھر ساحل کی ریل پر
گِر کر
کرچ کرچ ہو جائیں!

سُن کر میری بات کٹیلی
اُس کے لب پر
جاگ اُٹھی مُسکان رسیلی
بوجھل پلکوں کی درزوں سے
جھانکا
اُس کے من کا اُجالا
اُس نے جیسے
کروٹ لی ہے
اور پوُچھا ہے:
کہاں ہوں مَیں؟ کیا سمے ہوا ہے؟؟
اس سبلے انت گھنیری بوجھل نیند سے پہلے
رانجھن، سوہنی، مرزا، رادھا، پنوں — سارے

شبنم کے نمناک ستارے
ان میں سے بھی کوئی بچا ہے ؟
کوئی بچا ہے ؟؟

کون بچا ہے !
آنسو پی کر
رُندھی ہوئی آواز میں اُس سے
مَیں کہتا ہوں :
تُو کس جگ میں رُکا کھڑا ہے
آنکھیں کھول کے باہر آ
اور دیکھ کہ گلیاں سب
اُجڑی ہیں
گلشن بے آباد ہیں سارے
ریت کے دھارے !
ریت کے دھارے، تیل کے دھارے بن کر
اُبل پڑے ہیں
لوہا جیسے جاگ اُٹھا ہے
چہک رہا ہے
چاروں جانب گُوگ رہا ہے
تتلی، بھونرا، کوئل، چڑیا

——— سب لوہا ہے
لوہے کے پَر اُگ آئے ہیں !

وہ کہتا ہے :
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی ؟
مَیں جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
پھولوں میں رس
ندیوں میں چاندی بہتی تھی
دریاؤں کے پاٹ کشادہ
پیڑوں پر پھل پھول لگے تھے
گائے گابھن، گری لبالب
نار کی گود ہری تھی
راجہ خوش تھا، پرجا خوش تھی
دھرتی جیسے کنول کی صورت کِھلی ہوئی تھی !

مَیں کہتا ہوں :
وہ ست جُگ تھا سونے والے !
یہ کلجگ ہے
کلجگ ——— جو سرطان کی صورت

پھیل چکا ہے
دھواں اُگلتے، آہیں بھرتے
بوڑھی، بانجھ ملوں کے پنجر
کھمبوں کی صورت
دھرتی کے اندر سے جیسے اُگ آتے ہیں
جن کے زہر کو ہم
فصلوں پر
اور بچّوں پر
روز چھڑکتے ہیں
بس کی پُڑیاں
گیس کے گولے
ڈالر، ایڈز، پلاسٹک، پھوڑے
ان میں بانٹ رہے ہیں
دھوئیں کے کاجل سے
بچّوں کی
ننھی مُنّی سندر آنکھیں روشن کر کے
سیب ایسے ان کے گالوں پر
زہریلا، مٹیالا پاؤڈر مل کر
ہم کہتے ہیں:

آہا! کیسا نکل آیا ہے چاند سا مکھڑا
کیسا پیارا پھول کِھلا ہے!!

چُپ ہو جاؤ!
پھٹ کر اُس کا اندر جیسے چیخ اُٹھا ہے
رُک جاؤ
وہ چڑ مُڑ ہو کر
منّت کر کے
پوچھ رہا ہے:
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی!
مَیں جب سویا ——

مَیں کہتا ہوں:
نیند کے ماتے!
تُو جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
صدیوں تک
بیدار رہی تھی
پھر اک دن

آکاش سے اک دُم دار ستارہ
آنسو کا اک بھاری پربت
اس دھرتی پر آن گرا تھا
دھرتی جنتا بھول گئی تھی
لوہا، سر پہ اک فولادی تاج رکھے
اس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا
وہ دن اور پھر آج کا دن
اس دھرتی پر نہ رات آئی
نہ دن نکلا
نہ شام ہوئی ہے
ایک مسلسل آندھی
بے آرام ہوئی ہے
وقت نے اُٹھ کر
اک اندھی رفتار سے خود کو
لیس کیا ہے
بجلی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہے!

سونے والے!
تُو جب خود کو اوڑھ کے سویا

کانوں کے پٹ
اندر کی جانب کُھلتے تھے
کومل، میٹھی آوازیں تب
اندر سے دستک دیتی تھیں
اندر ـــــ جو پریوں کا مسکن
آئسس، شمس، زیوس، شیوـــــ سب کی
آوازوں کا ایک نگر تھا
خود "باہر" بھی
جس "اندر" کا
اک حصّہ تھا!

سونے والے!
تو گُم صُم، بیہوش پڑا تھا
اور ہم روگی جاگ رہے تھے
یک دَم
ایک پہاڑ پھٹا تھا
پنڈورا کا قفل کُھلا تھا
اور بلائیں
چیخوں کی صورت نکلی تھیں

کومل، میٹھی آوازوں پر جھپٹ پڑی تھیں
بم، راکٹ، جٹ جمبو، باجے، بھڑک اُٹھے تھے
تُند ہَوا کی چیختی ٹھوکر
پھیل گئی تھی
کانوں کی نابینا آنکھیں
باہر پر مرکوز ہوئی تھیں
"باہر" اور "اندر" میں اک
دیوار کھنچی تھی
تیز نکیلی آوازوں کی
فصل اُگی تھی!

فصل اُگی تھی؟؟
مجھے بتا
اس بے سمتی
اس ہاہا کار میں
چیخوں کی اندھی برکھا
اور چُپ کی
تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے؟

کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟

سونے والے!
جب دھرتی پر آوازوں کا شور اُٹھا تھا
اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے
لوہے کے رو بوٹ بنے تھے
بے چہرہ، بے نام ہوئے تھے
کالے پیلے ہندسے بن کر
لفظوں کے انکھووں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے
اک اک "لفظ" پہ ثبت ہوئے تھے

اور اب
ہندسے ہی ہندسے ہیں
جمع کرو —— تو دُگنے تگنے ہو جاتے ہیں
لاکھوں کا اک لشکر بن کر
آگ اور خون کے کھیل کا منظر
دکھلاتے ہیں
ضرب لگے تو
بھنور سا بن کر تیز ہوا کا،

پاگل بھوتوں کے
وحشی گرداب کی صورت
ایک ہی پل میں
دھرتی اور آکاش سے اونچے اٹھ جاتے ہیں
کرو اگر تفریق —— صفر ہو جاتے ہیں!

تو کہتا ہے:
چپ کی تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے
کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟
میں کہتا ہوں:
ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے
یہ سب
نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!
ساگر جس نے
ان کیڑوں کو جنم دیا تھا
اب اک گندا جوہڑ بن کر
ان کے اندر کے جوہڑ سے
آن ملا ہے

ساگر کا اُپمان ہوا ہے
ساگر ماں ہے
ماں ہتھیا
اس کلجگ کا ایمان ہوا ہے !

اور اب ــــــــ یہ سب
گندے کیڑے
جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں
جنگل جس نے کتنا ان سے
پیار کیا تھا
ان کی کتنی نسلوں کو پالا پوسا
آباد کیا تھا
اب یہ اس جنگل کو
اپنے ساتھ ستی ہو جانے پر
مجبور کریں تو بول
یہ کیسا انیائے ہے !
جنگل جنگل آگ لگی ہے
اور یہ مُورکھ
لُوکے تھامے
جگمگ جگمگ ناچ رہے ہیں

گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
رو رو کر ہلکان ہوتے ہیں
اندر
ماس کے جلنے کی بدبُو پھیلی ہے
باہر
نیزہ پھن پھیلائے جھوم رہا ہے

اور جنگل کے پنچھی سارے
آگ کے جلتے بجھتے اکھر
دُور ــــــ آکاش کی جانب اُڑ کر
چاند اور سورج کے کنگروں پر
جا بیٹھے ہیں
وہاں سے بُھر کر
حرفوں کے ریزوں کی صورت
دھرتی کے آنگن میں جیسے
آن گرے ہیں
اک منحوس عبارت بن کر
ہم پُرشوں کے ماتھوں پر
مرقوم ہوتے ہیں

اور ہم
جو اب پُرش نہیں ہیں
اپنی اپنی قبروں پر ہم
نصب ہوئے ہیں
ہم جو اڑتی کالک اور
آواز کے چاک سے اترے ہوئے
کوزوں کے نقش ہیں
اپنے آپ کی پرچھائیاں ہیں
دھڑ دھڑ جلتے جنگل میں ہم
ننگے پیروں چلتے
اپنے آپ کا اک مدھم سا عکس
ہوا کا لمس بنے ہیں
ہم اب راکھ ہیں اور
ہم سب نے
اپنی راکھ کو
اپنے ہی تاریک مُکھوں پر
تھوپ لیا ہے
آنسو کی بے نام نمی سے
اپنی پیاسی "پیاس" کو بے زنجیر کیا ہے !

سونے والے !

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے

برسوں پہلے

تیری اس کُٹیا سے دُور

پہاڑ کی اوٹ میں اک قصبہ تھا

اُس قصبے میں

نامی نام کی ایک سہاگن

سدا سہاگن

جانے کب سے

اپنی ہی خوشبو کے اندر

بسی ہوئی تھی

سب کہتے ہیں

اک دن ایسا بھی آیا تھا

اُس خاموش ابھاگن کا اکلوتا بیٹا

جھیل کنارے گیا

مگر لوٹا ہی نہیں تھا

اور وہ عورت

ایک ہی شب میں

کالی بن کر بھڑک اُٹھی تھی

"ماں پُترو! ماں پُترو[1]!" کہتی
قصبے کی گلیوں میں
ساری رات بھٹکتی پھرتی تھی
بند کواڑوں پر
دو ہتّڑ مار کے روتی
چیخوں سے حملے کرتی تھی
اور گلیوں میں
جو بچّہ بھی اُس کو ملتا
وہ خُونی پنجوں سے اس کی
بوٹی بوٹی کر دیتی تھی
پھر ندّی پر جا کر اُس کو
کھا جاتی تھی!

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
ماں پُترو! ماں پُترو! — کی مانوس صدا
بازاروں اور گلیوں سے نکل کر
کھیتوں، ٹنڈ مُنڈ پیڑوں

[1] "میاں پوترو" — کشمیری زبان کا لفظ بمعنی "میرے بیٹے!"

سُوکھے اور سنسان پہاڑوں
صحراؤں، دریاؤں اور جنگلوں میں پھیل چکی ہے
لپ لپ کرتے شپّرک بن کر
ایک اک شاخ سے جھُول گئی ہے
ایک اک ہونٹ سے
پھُوٹ رہی ہے
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
خود دھرتی بھی
اک شپّرک ہے
نامی نام کی اک ناری ہے
ماں پُتر و ! ماں پُتر و !—— کہتی
سُورج کی گلیوں میں
چیخیں مار رہی ہے
جھُکے ہوئے آکاش کی
کُنڈ کنگڑی[1] کے اندر
جھانک رہی ہے !

سونے والے !

---

[1] کانگڑی (کشمیر کے لوگ آگ تاپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں)

تو ـــــ کُٹیا کا چھلکا اوڑھے
بیج کی صورت
بند پڑا ہے
اور ہم تیری کھوج میں
نامی نام ہوئے ہیں
کتنے بے آرام ہوئے ہیں
جب سے ہم
" اندر " سے کٹ کر
" باہر " میں آباد ہوئے ہیں
بھاری بوجھل آوازوں کے
قدموں میں پامال ہوئے ہیں
اور ہماری آنکھیں جب سے
اگنی وِش
کی برکھا سے دوچار ہوئی ہیں
آتش بازی کے منظر کا حصّہ بن کر
خود بھی آتش بار ہوئی ہیں
اندر والے دیپ کی
بھیگی خوشبو سے ناراض ہوئی ہیں !

نیند کے ماتے!

دیکھ! ___ وہ سندر دُھوپ

وہ اُونی شال

جسے ہم اوڑھ کے روز پھرا کرتے تھے

دُھوپ کہ جس کے لمس میں

ماں کے نرم گداز لبوں کی شیرینی تھی

جس کے سانس میں

مرغابی کے پَر کی گرمی

کچّی نرم سگندھ کلی کی

رچی بسی تھی

وہ ناری

اب آتش پیکر

آتش کا پرکالہ ہے

اک چنگاری ہے

بھڑک اٹھی ہے

آنکھوں کے نغرفوں سے ہم کو

گھُور رہی ہے

ہونٹوں کی محراب سے لُو کے

پھینک رہی ہے!

سونے والے !

اب تو اُٹھ جا

دیکھ کہ آگ گھنے جنگل کی

آتش ناک بھجنگ کی صورت

شُوک رہی ہے

اور ہَوا

بدمست ہوئی ہے

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے

پہلے بھی اک ایسا ہی

طُوفان آیا تھا

تب اک بیج کی کشتی میں تُو

پانی کی شِکنوں پر چلتا

ایک پہاڑ پہ جا پہنچا تھا

ایک نیا انکھوا

پھُوٹا تھا

ایک نیا سُورج نکلا تھا !

آج وہی طوفان

نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے

لیکن اب کی بار یہ طوفاں
اگنی کا ہے
جلے ہوئے کیسر[1] کے ڈنٹھل
شعلوں کے گرداب
ہَوا کا شور
گھنے بادل کے تن پر
دھڑ دھڑ پڑتے
آگ کے درے
ایک عجب کہرام بپا ہے
تُو —— اپنی کُٹیا کے اندر
بند پڑا ہے
سونے والے!
باہر آ
اور امرت رس سے بھرا ہُوا
مہتاب کا کاسہ
سُورج کے ہاتھوں سے لے کر پی
کہ تیری آنکھ سے پھر

---

[1] زعفران

کرنوں کا سونا

چشمہ بن کر پھوٹ بہے
اس میرے جُگ کو
نئے جنم کی ملے بشارت
میرے مُورکھ دل کو بھی آنند ملے
میری آنکھ بھی
کشتی کا بہروپ بھرے
پال اُڑا کر
نورانی موجوں پر سفر کرے
بُجھے ہوئے اِس میرے قلم کی
نوک پہ بھی اک
پربت جتنے
شبنم ایسے
لفظ کا دیپ جلے !!
اک "لفظ" کا دیپ جلے !!